Date of Publication : 02-06-2014

PRICE Rs. 2/-

POSTED ON 03-04 June 2014
R.N.I No. 2186/57

POSTAL REGN. NO. DL (C) -01/1195/2012-14
Licensed to Post Without Prepayment U (C)160/2012-14

HAMARI ZABAN (WEEKLY)

ہفت روزہ

ہماری زبان

انجمن ترقی اردو (ہند) نئی دہلی

8-14 June 2014
Issue: 22, Vol.:73

۸تا۱۴؍جون ۲۰۱۴ء
شمارہ نمبر: ۲۲، جلد نمبر: ۷۳

یہ مضمون عابد علی عابد کی کتاب 'شعر اقبال: اقبال کے شعور تخلیق کا جائزہ' کا ایک ذیلی باب ہے جس میں اقبال کی شاعری کو مشرقی شعریات کی روشنی میں دیکھنے کی کوشش کی گئی ہے۔ یہ مضمون 'ہماری زبان' کے قارئین کے لیے اس لیے نقل کیا جا رہا ہے کہ اقبال کی شاعری کے بارے میں بالعموم یہ کہا جاتا رہا ہے کہ اس میں فنی رکھ رکھاؤ پر اس طرح زور نہیں دیا گیا جیسا کہ اردو اور فارسی کے دوسرے شاعروں کے یہاں ملتا ہے۔ یہ مضمون اس مفروضے کو رد کرتا ہے۔ دوسرے یہ کہ مشرقی شعریات پر اردو شاعری کی تفہیم کے سلسلے میں اصرار کو ہمارے زمانے کے بعض نام نہاد نقاد ادبی اولیات میں سے بتاتے رہے ہیں، جب کہ عابد علی عابد کی یہ کتاب جو ۱۹۶۳ء میں شائع ہوئی تھی اور ان کی دوسری تحریروں میں بھی مشرقی شعریات پر اصرار کا رویہ واضح طور پر ملتا ہے، اس لیے اس مضمون کو اس زاویے سے بھی دیکھنا چاہیے۔ (ادارہ)

پہلی قسط

محسناتِ شعر

صنائع و بدائع لفظی و معنوی

صنائع لفظی و معنوی آج کل چند ایسی بدنام ہوگئی ہیں کہ اگر یہ دعویٰ کیا جائے کہ اقبال ابلاغ و اظہار، مطالب کے لیے انھیں بہت چابک دستی اور ہنرمندی سے استعمال کرتے ہیں تو اکثر پڑھنے والے تعجب کا اظہار کریں گے۔

اس کی وجہ یہ ہے کہ ایک مدت دراز سے ہم لوگ اپنے قدیم انتقادی نظریات اور متعلقہ مباحث سے ناآشنا ہوتے چلے جا رہے ہیں۔ اگر اس کے ساتھ یہ ہوتا کہ مغربی اسلوب انتقاد اور پیمانہ ہائے تقدیر شعر سے ہم کلیتاً آگاہ ہوتے تو اردو ادب کو پرکھتے وقت ایک واضح معیار ہمارے سامنے ہوتا، لیکن ہوا یہ ہے کہ بہ استثنائے چند آج کل کے نقاد نہ تو مغرب کے انتقادی نظریات سے پوری آگاہی رکھتے ہیں نہ اپنی قدیم انتقادی اقدار سے آگاہ ہیں۔ اس کا نتیجہ یہ نکلا ہے کہ اردو میں انتقاد بے حد غیر متوازن اور غیر واضح ہے۔ اردو کو خالص مغربی اسلوب انتقاد کے مطابق جانچا گیا تو اس قسم کا نتیجہ برآمد ہوگا جو عبداللطیف صاحب نے غالب کے کلام کو پرکھنے کے بعد نکالا کہ غالب کا شمار جلیل القدر شعرا میں نہیں ہو سکتا۔

حقیقت یہ ہے کہ کسی زبان کے ادب کو اسی نظام تنقید کی حدود میں رکھ کر جانچا جا سکتا ہے جو اس ادب کی متعلقہ معاشرت اور ثقافت سے مربوط ہوتا ہے۔ اگر ہم کسی زبان یا قوم کے ادب کو اس نظام سے علاحدہ کر کے کسی غیر قوم یا زبان کے پیمانۂ انتقاد سے ناپیں گے تو جو نتائج ہم مستخرج کریں گے ان میں سے بعض تو بالکل غلط ہوں گے اور بعض ان نیم حقائق (Half Truths) سے مشابہ ہوں گے جو کذب و دروغ سے زیادہ خطرناک ثابت ہو سکتے ہیں۔ یہ درست ہے کہ انتقادی اسالیب، نظریات اور پیمانے کچھ اقدار مشترک بھی رکھتے ہیں لیکن یہ قدریں بھی اکثر معاشرتی اور ثقافتی اختلاف اور سیاسی و تاریخی کوائف سے اثر پذیر ہو کر ایسی صورتیں اختیار کرتی ہیں کہ اشتراک کے وجود کا شعور بھی نہیں ہوتا ہے اور اگر ہوتا بھی ہے تو واضح نہیں ہوتا۔ کچھ بنیادی اقدار ایسی ضرور ہیں جو کم و بیش ہر انتقادی نظام میں مسلمات کی حیثیت رکھتی ہیں لیکن مشکل یہ ہے کہ اگر صرف مسلمات سے کام لے کر کسی فن پارے کو پرکھا جائے گا تو انتقاد ضرور ناقص ہوگا اور اکثر و بیشتر سطحی بھی ہوگا۔ پھر یہ بھی ہے کہ مسلمات کی تعبیر و تفسیر میں اختلاف ہوگا، اور یہی اختلاف ایسی صورت اختیار کرے گا کہ مسلمات کے معانی بدل جائیں گے۔ اسی طرح اگر اردو ادب کو صرف قدیم مشرقی اقدار ادب کے مطابق پرکھا گیا تو بہ مرور زمان سائنسی انکشافات اور علمی و فنی انکشافات سے انسان کی بصیرت میں جو اضافہ ہوا ہے اس سے بالکل کام نہیں لیا جا سکے گا۔ نفسیات کے دائرے میں جو حیرت انگیز معلومات ذہن انسانی کو میسر آئی ہیں ان کی وجہ سے ہم اب پرانے نقادوں اور ادیبوں کی نسبت اپنی ذات کے کوائف کا زیادہ گہرا شعور حاصل کر سکتے ہیں اور یہ بڑا ظلم ہوگا کہ کسی فن پارے کو پرکھتے وقت ہم ان تمام انکشافات کی طرف سے آنکھیں بند کر لیں جن کی بدولت ہم آج فن کار کے محرکات تخلیق، عمل تخلیق اور متعلقہ کوائف کا بہتر تجزیہ کر سکتے ہیں۔ آج کل کے انسان کو (اور ظاہر ہے کہ فن کار بھی انسان ہے) اپنی ذات اور اپنی واردات و کیفیات اور اعمال و عوامل کے متعلق ایسی معلومات حاصل ہو چکی ہیں کہ ماضی قریب کا انسان بھی ان کا تصور نہیں کر سکتا تھا۔ مختصر یہ ہے کہ آج کل اردو ادب کو پرکھتے وقت نقاد پر لازم ہے کہ وہ مشرقی اسلوب انتقاد کے اس جلیل القدر ذخیرے سے بھی فائدہ اٹھائے جو اس کی میراث ہے اور عصر حاضر کے ان نئے انتقادی نظریات کو بھی نظر میں رکھے جو جدید علمی و فنی انکشافات سے مربوط ہیں۔

بات یہاں سے شروع ہوئی تھی کہ اقبال صنائع لفظی و معنوی کو بہت ہنرمندی اور چابک دستی سے استعمال کرتے ہیں اور یہ بات سن کر اکثر لوگوں کو تعجب ہوگا کیوں کہ بہ مرور زمان ہم لوگ مشرق کے انتقادی نظریات اور متعلقہ مباحث سے ناآشنا ہو گئے ہیں۔

عابد علی عابد

دراصل صنائع لفظی و معنوی کے کلمات پڑھ کر یا سن کر ہمیں فوراً لفظی شعبدہ گری کا خیال آتا ہے اور ساتھ ہی یاد آتا ہے کہ اس شعبدہ گری کی مثالیں یہ ہیں:

زلف لٹکا کے وہ جس دم سر بازار چلا
ہر طرف شور اٹھا مار چلا مار چلا

آنکھ پڑتے ہی قرار و صبر و طاقت لے گئے
خال مشکیں دلبری میں گوئے سبقت لے گئے
اس شکر لب کی محبت میں مرا ہوں دیکھنا
غیر بھر کے کوزے تربت پہ شربت لے گئے

لڑ کر رقیب یار کے گھر سے نکل گیا
مریخ آج برج قمر سے نکل گیا

حقیقت یہ ہے کہ لفظی شعبدہ گری بذاتہ کوئی بری چیز نہیں، ہنرمندی اور چابک دستی سے برتی جائے تو محاسن سخن میں شمار ہوتی ہے اور خواہ مخواہ از راہ تکلف استعمال

کی جائے تو ذوق سلیم پر بار ہوتی ہے۔

یوسف حسین خاں اردو غزل میں لکھتے ہیں:

"یہی حال رعایت لفظی کا ہے۔ اگر اس سے شعر کی رمزی یا ایمائی کیفیت یا کسی آلف کے بڑھ جائے تو سامع اس سے لطف اندوز ہوگا ورنہ اگر یہ احساس پیدا ہو کہ شاعر نے تکلف اور تصنع سے کام لیا ہے تو طبیعت اس کی طرف کبھی مائل نہ ہوگی۔ ایسی لفظی رعایتوں سے بجائے کوفت اور بے لطفی کے کچھ حاصل نہیں۔ یہ ضلع جگت اور لفظوں کی شعبدہ کاری روح تغزل کا خون کرتی ہے۔ چند مثالیں درج کی جاتی ہیں:

آتے ہی تو نے گھر کے پھر جانے کی سنائی
رہ جاؤں سن نہ کیوں کر یہ تو بری سنائی
(ذوق)

وہ جو دوپٹہ تو اپنا ململ کا
ناتواں ہوں کفن بھی ہو ہلکا
(ناسخ)

ان مثالوں کے خلاف ایسی مثالیں بھی ہیں جن میں رعایت لفظی جدت ادا میں جان ڈال دیتی ہے اور شعر کا معنوی اور رمزی اثر کہاں سے کہاں پہنچ جاتا ہے۔ یہاں صرف چند مثالوں پر اکتفا کیا جاتا ہے:

زلفیں اس کی ہوا کریں برہم
ہم کو بھی پیچ و تاب ہے سو ہے

گرچہ آوارہ جوں صبا ہیں ہم
لیک لگ چلنے میں بلا ہیں ہم
(میر)

لکھتے رہے جنوں کی حکایات خوں چکاں
ہر چند اس میں ہاتھ ہمارے قلم ہوئے

بوئے گل، نالۂ دل، دود چراغ محفل
جو تری بزم سے نکلا سو پریشاں نکلا

اس قسم کی مثالوں سے غالب کا دیوان بھرا پڑا ہے۔ اور دوسرے شاعروں کے ہاں بھی کثرت سے ایسی مثالیں ملتی ہیں جن میں رعایت لفظی سے کلام کی شگفتگی، بلندی اور تاثر میں اضافہ ہوا ہے۔"

صنائع لفظی و معنوی کا تعلق علم بدیع سے ہے اور علم بدیع معانی اور بیان سے مربوط ہے۔ صنعتوں کے صحیح محل استعمال کے رموز بھی دریافت ہو سکتے ہیں کہ معانی، بدیع اور بیان کا ربط باہمی واضح کیا جائے اور بدیع کی تعریف کی تشریح و توضیح کی جائے۔

معانی ان قواعد و ضوابط سے عبارت ہے جن سے آگاہ ہونے کے بعد ادیب اپنے مفہوم کے ابلاغ و اظہار پر قدرت تام حاصل کرتے ہیں اور الفاظ کے صحیح اور برمحل استعمال کا طریقہ سیکھتے ہیں۔ فصاحت اور بلاغت کے مباحث اسی علم کے دائرے میں محصور ہیں اور اس لیے لازماً کلام فصیح اور کلام غیر فصیح میں اور کلام بلیغ و کلام غیر بلیغ میں امتیاز کرنے کا طریقہ بتانا بھی اسی علم کا کام ہے۔

بیان ان اصول و قواعد سے بحث کرتا ہے جن سے آگاہ ہونے کے بعد ادیب کو یہ معلوم ہو کہ ابلاغ و اظہار مفہوم کے مختلف اسالیب کیا ہیں۔ یہی علم اس بات کی توضیح کرتا ہے کہ مختلف اسالیب میں سے کون سا اسلوب اظہار و ابلاغ کے لیے سب سے زیادہ موزوں اور مناسب ہے۔

اس علم کا مدار مجاز مرسل، کنایہ، تشبیہ اور استعارہ کے مباحث پر ہے۔ اب معانی اور بیان میں یہ فرق بھی واضح ہو گیا کہ بیان الفاظ کے معانی مجازی سے بحث کرتا ہے اور علم معانی مجاز کو چھوتا بھی نہیں۔

بدیع وہ علم ہے جس سے فصیح اور بلیغ کلام کی لفظی اور معنوی خوبیاں معلوم ہوتی ہیں اور جو ادیب کو کلام کی زینت اور آرائش کے اسالیب اور طریقے بتاتا ہے۔ سجاد مرزا نے اس کی تشریح یوں کی ہے کہ تزئین و تحسین کلام کے سلسلے میں یاد رکھنا چاہیے کہ لفظ معنی کا تابع ہے۔ جو چیزیں معانی میں خوبی اور حسن پیدا کرتی ہیں وہ صنائع معنوی کہلاتی ہیں اور جن آرائشوں کا تعلق محض لفظوں سے ہوتا ہے وہ صنائع لفظی کہلاتی ہیں۔ یہاں یہ بات ملحوظ رکھنی چاہیے کہ علم بدیع اس بات کا گویا اعتراف کرتا ہے کہ حسن پیکر میں بھی ہوتا ہے اور معانی میں بھی۔ موجودہ اسلوب انتقاد کے مطابق لفظ اور معنی ایک ہی حقیقت کے دو رخ ہیں انھیں محض نظریاتی طریقے پر جدا کیا جا سکتا ہے۔ معانی کی نوعیت یہ فیصلہ کرتی ہے کہ الفاظ کون سے استعمال کیے جائیں گے تاکہ معانی مطلوب کی تمام دلالتیں واضح ہو جائیں۔ غور کرنے سے معلوم ہوگا کہ بدیع کی جو تعریف کی گئی ہے وہ لفظ و معنی کے ربط کے موجودہ تصور کی نقیض نہیں، وجہ یہ ہے کہ بدیع کا موضوع تحسین کلام بتایا گیا ہے اور کلام میں الفاظ و معانی دونوں شامل ہیں۔ یہ ملحوظ رکھ کر علم کی تعریف کو جانچا جائے تو معلوم ہوگا کہ دراصل یہ وہ علم ہے جو ہیئت اور پیکر میں وہ حسن پیدا کرنے کے گر سکھاتا ہے جو فنون لطیفہ سے مخصوص ہوتا ہے اور معانی کے ابلاغ و اظہار کے سلسلے میں ان اصولوں کی طرف اشارہ کرتا ہے جن سے کام لے کر ادیب معانی اور لفظ میں وہ مطابقت تام پیدا کر سکتے ہیں جس کے بغیر ادب وجود میں نہیں آتا۔ صنعتیں لفظی ہوں یا معنوی ان کا مقصد یہی ہے کہ وہ لفظ و معنی میں مطابقت تام پیدا کرنے میں ممد و معاون ہوں اور اس حسن و جمال کی تخلیق میں مدد دیں جو جان کلام ہے۔

مزید غور کرنے سے معلوم ہوگا کہ علم بدیع کے مطالعے کی غایت یہ تھی کہ شاعر اپنے مافی الضمیر کا اظہار سوچ سمجھ کر کرے۔ تزئین و آرائش کلام کی ترغیب اس لیے دلائی گئی کہ جب سخنور اور انشا پرداز صنعت گری کی طرف مائل ہوگا اور عمل تخلیق کے مختلف مراحل سے گزرے گا تو لازماً اسے اظہار و ابلاغ کے مختلف پیرایوں پر غور کرنا پڑے گا۔ آرائش کلام کی کوشش میں جو غور و فکر صرف کیا جاتا ہے اس سے یہ فائدہ ہو سکتا ہے کہ الفاظ کی وہ خاص ترتیب حاصل ہو جائے جو معانی مطلوب کے اظہار کے لیے مقدر ہو چکی ہے اور جس کی جستجو تخلیقی فن کار کو بے تاب و بے قرار رکھتی ہے۔ بالفاظ دیگر صنائع معنوی استعمال کرنے کی ترغیب دلانا تخلیقی عمل کی گرم رفتار کو روکنے کا بہانہ ہے، مقصد یہ ہے کہ فن کار جلدی نہ کرے اور الفاظ کی اس خاص ترتیب کی جستجو کرتا رہے جو مفہوم مطلوب کی تمام دلالتوں کو ادا کر سکتی ہے۔ مختلف صنائع معنوی کی تعریفوں پر غور کرنے سے معلوم ہوگا کہ ان کے برمحل استعمال سے مفہوم کے ابلاغ و اظہار میں بڑی مدد ملتی ہے۔ اس سلسلے میں مراعات النظیر، ایہام تناسب، توجیہ اور تضاد بڑی خوب صورت اور خیال افروز صنعتیں ہیں (ان کی تشریح آگے آتی ہے)۔ جو فن کار اپنے عمل تخلیق میں کاوش اور محنت سے کام لے گا اس پر یہ نکتہ خود بہ خود روشن ہوگا کہ صنائع معنوی کے استعمال کی غایت کیا ہے۔ جب فن کار شعوری طور پر صنعتیں استعمال کرے گا تو وہ لازماً الفاظ کے استعمال میں محتاط ہوگا اور صرف ایسے الفاظ استعمال کرے گا جو صوتی یا لفظی معنوی اعتبار سے مربوط ہوں۔ ایسا فن کار اپنے کلمات کی تمام دلالتوں پر غور کرنے کے بعد مفہوم کے ابلاغ و اظہار کے لیے انھیں اس طرح استعمال کرے گا کہ تمام صوتی اور معنوی تلازمے قائم رہیں۔ اس تمام کاوش کا مقصد اگر یہ ہو کہ مطالب و معانی کی توضیح ہو اور الفاظ و معانی میں مطابقت تام پیدا ہو تو صنعتیں خوب صورت اور دل پذیر ہوں گی لیکن اگر فن کار محض آرائش کلام کے لیے صنعتوں کا انبار لگا دے گا تو پڑھنے والے کی توجہ مطالب کی طرف سے ہٹ جائے گی اور صرف صنائع کلام ملحوظ خاطر رہ جائیں گی۔ اس سے ممکن ہے پڑھنے والے کو کچھ تفریح ضرور حاصل ہو لیکن اصل مطلب کہ توضیح مفہوم ہے، فوت ہو جائے گا۔

پہلے بالتفصیل بیان کیا جا چکا ہے کہ اقبال نے اپنے مفہوم کے ابلاغ و اظہار کے لیے مشرق و مغرب کے انکشافات اور انتقادی نظریات سے فائدہ اٹھایا ہے لیکن صنائع معنوی کے استعمال کے سلسلے میں اس نے مشرق کے بلند مرتبہ شعرا کی پیروی کی ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ انھیں ایسے ہم نفس دوست اور استاد میسر آئے تھے جو نہ صرف معانی بیان بدیع کے رموز سے خوب واقف تھے بلکہ ان علوم کی غایت بھی اقبال کے ذہن نشین کر سکتے تھے۔

اقبال کا کمال یہ ہے کہ انھوں نے صنائع لفظی و معنوی سے اس طرح کام لیا ہے کہ پڑھنے والے کی توجہ مطالب و مفہوم کی طرف رہتی ہے لیکن یوسف حسین خاں کے الفاظ میں صنعتوں کے استعمال سے کلام کی رمزی تاثیر میں اور خیال افروزی میں اضافہ ہو جاتا ہے۔ اقبال کے کلام میں کم و بیش تمام صنائع معنوی بڑی ہنرمندی اور چابک دستی سے استعمال ہوئی ہیں لیکن تضاد، حشو ملیح، مراعات النظیر، حسن تعلیل، ایہام، تضاد اور ایہام تناسب سے انھوں نے زیادہ کام لیا ہے کہ ان کی مدد سے معانی کی تمام دلالتیں روشن ہو جاتی ہیں۔

مراعات النظیر اور ایہام تناسب تو خاص طور پر خیال افروز صنعتیں ہیں اور ان کا مقصد یہ ہے کہ کسی خیال اور اس کے متعلقہ کوائف کے ابلاغ اور اس کی دلالتوں کی توضیح کے لیے ذوق سلیم اور حسن انتخاب سے کام لے کر شاعر جہاں تک ممکن ہو وہ تمام لطیف معانی اور خیال افروز الفاظ و کلمات کام میں لائے جن سے خیال یا متعلقہ کوائف یا احوال کا کوئی پہلو مربوط ہو، تاکہ الفاظ سے معانی کے تمام تہ در تہ سلسلے مترشح ہوں اور ذہن صوتی یا معنوی اعتبار سے مربوط الفاظ و کلمات اور تلازموں کا سہارا لے کر اس منزل کی طرف رواں ہو جہاں وہ رموز و اسرار بھی منکشف ہو جاتے ہیں جو بہ ظاہر الفاظ سے متبادر نہیں ہوتے۔

مراعات النظیر کی تعریف یوں کی گئی ہے کہ کلام میں کئی ایسی چیزیں مذکور ہوں جو باہم مناسبت رکھتی ہوں یا ایسے الفاظ جمع کیے جائیں جن میں نسبت معنوی ہو۔ شرط یہ ہے کہ یہ نسبت تضاد یا تقابل کی نہ ہو یعنی ایسی چیزیں مذکور نہ ہوں جو ایک دوسرے کی ضد ہیں۔

اب تضاد کی تعریف خود ہی متعین ہو گئی یعنی کلام میں ایسے الفاظ جمع کرنا جن کے معانی میں فی الجملہ تقابل ہو یا ایسی چیزوں کا ذکر کرنا جو ایک دوسرے کی ضد ہوں اور ضد بھی ایک نسبت ہی کی قسم ہے (کہ حقائق بھی تخالف یا تضاد ہی سے پہچانے جاتے ہیں)۔

ایہام تناسب

اس صنعت کی صورت یہ ہے کہ شاعر کلام میں دو لفظ استعمال کرتا ہے جن میں سے ایک لفظ کے دو معنی ہوتے ہیں۔ ایک معنی مطلوب و مقصود اور دوسرے معنی غیر مطلوب، غیر مقصود۔ معانی غیر مطلوب یا غیر مقصود کا اس پہلے لفظ سے تعلق ہوتا ہے جس کا ذکر اوپر ہو چکا ہے۔ اس طرح سے تناسب کی بھی اور ایہام کی بھی صورت پیدا ہو جاتی ہے۔ اس صنعت کی تفصیل مندرجہ ذیل شجرے سے ظاہر ہوگی:

کلمہ نمبر ۱ (رنگ) — کلمہ نمبر ۲ (گل)
معانی مطلوب (روش، طریقہ، انداز)
معانی غیر مطلوب (رنگ، لون)

انیس کہتا ہے:

گلدستۂ معنی کو نئے ڈھنگ سے باندھوں
اک پھول کا مضموں ہو تو سو رنگ سے باندھوں

سامنے کے بیان رنگ کے دو معنی ہیں یعنی روش، طریقہ، انداز ایک اور دوسرے وہی سامنے کے معنی یعنی رنگ۔ معانی مطلوب، روش، انداز اور طریقہ ہیں لیکن دوسرے معانی جو غیر مطلوب ہیں انھیں پھول سے ایک گونہ مناسبت ہے یا تعلق ہے۔ (باقی آئندہ)

قلم کارِ نامی - آزاد بلگرامی

رؤف خیر (1-137/11-9)، موتی محل، گولکنڈہ، حیدرآباد - 500008 (اے۔ پی)

مرزا غالب کی پیدائش سے تقریباً ایک سو برس پہلے بلگرام کی سرزمین سے ایک نابغۂ روزگار ۲۵؍صفر ۱۱۱۶ھ مطابق ۲۹؍جون ۱۷۰۴ء کو اٹھا اور ہندوستان کی ادبی تاریخ کا انمول رتن ثابت ہوا۔ ہندوستان میں عربی و فارسی ادب کا تذکرہ، آزاد بلگرامی کے ذکر کے بغیر ادھورا سمجھا جاتا ہے۔ میر غلام علی آزاد بلگرامی بن نوح الحسینی الواسطی البلگرامی ابن زید شہید کا سلسلۂ نسب امام زین العابدین تک پہنچتا ہے۔ ان کی ابتدائی تعلیم بلگرام ہی میں ہوئی۔ اولین استادوں میں میر طفیل محمد بلگرامی اہمیت کے حامل ہیں۔ عربی، فارسی اور دینیات انھوں نے اپنے نانا عبدالجلیل بلگرامی سے اور علم عروض اور فنون ادب کی کتابیں اپنے ماموں سید محمد سے پڑھیں۔

۱۱۵۱ھ مطابق ۱۷۳۸ء میں میر غلام علی آزاد زیارت حرمین شریفین سے مشرف ہوئے۔ مکہ میں شیخ عبدالوہاب بن احمد طنطاوی مصری شافعی (متوفی ۱۱۵۷ھ) سے علم حدیث حاصل کیا۔ مدینہ منورہ میں قیام شیخ محمد حیات سندی ثم مدنی (متوفی ۱۱۶۳ھ) سے صحاح ستہ پڑھ کر سند حاصل کی۔ مکہ و مدینہ کے سفر سے پہلے آزاد بلگرامی کو تصوف، اوراد و وظائف وغیرہ سے بھی دلچسپی پیدا ہو گئی تھی، وہ چشتیہ سلسلے سے وابستہ ہو گئے تھے اور لطف اللہ حسینی الواسطی بلگرامی (متوفی ۱۱۴۳ھ) سے بیعت تھے۔

شعر و ادب کے ساتھ ساتھ تصوف کا تعلق تو ان کا تھا ہی ہے مگر آزاد کو قرآن و سنت سے گہرا شغف تھا اور انھوں نے محدثین عصر سے باضابطہ علم حدیث مکہ و مدینہ جیسے گہوارہ ہائے علم میں حاصل کیا اور سند بھی حاصل کی۔ یہی سبب ہے کہ میر غلام علی آزاد بلگرامی نے مختلف جہات میں اپنے انمٹ نقوش چھوڑے ہیں۔ وہ زیارت حرمین کے اشتیاق میں پاپیادہ ہی نکل پڑے تھے۔ بلگرام سے سروج پہنچتے پہنچتے پاؤں میں آبلے پڑ گئے۔ مالوے میں ان زمانے میں نظام الملک آصف جاہ مرہٹوں سے برسرپیکار تھے۔ نظام کو آزاد کا حال معلوم ہوا تو بلوا بھیجا اور سواری سے سرفراز فرمایا۔ آزاد نے آصف جاہ کی خدمت میں دعائیہ رباعی پیش کی:

اے حامی دیں، محیط جود و احساں
حق داد ترا خطاب آصف شایاں
او تخت بہ درگہ سلیماں آورد
تو آل نبی را بہ در کعبہ رساں

سرزمین عرب میں تحصیل علم حدیث اور زیارت حرمین شریفین کے بعد ۱۱۵۲ھ مطابق ۱۷۳۹ء میں اورنگ آباد دکن واپس آگئے اور باقی زندگی یہیں گزار دی۔ نظام الملک آصف جاہ نے قدر افزائی فرمائی اور اپنے بیٹے نواب ناصر جنگ کا اتالیق مقرر کیا تھا۔ ان آصف جاہی باپ بیٹوں ہی میں اقتدار کے لیے رسہ کشی ہوئی تو آزاد بلگرامی نے حسن تدبیر سے اس خانہ جنگی کا خاتمہ کروادیا۔ ناصر جنگ کا قصور معاف کروایا۔ بعد میں بھی ناصر جنگ اپنے باپ کا جانشین ٹھہرا۔ صلابت جنگ نے آزاد بلگرامی کی علمی خدمات کے اعتراف میں انھیں 'سراج المحدثین' اور 'رئیس الفضلا' کا خطاب عطا کیا۔ میر غلام علی آزاد بلگرامی نہ صرف یہ کہ ایک مستند تذکرہ نگار، مورخ و محدث گزرے ہیں بلکہ انھوں نے عربی و فارسی ادب میں اپنی بے پناہ شعری صلاحیتوں کے شاہ کار بھی چھوڑے ہیں۔ یہ وسیع المشرب قلم کار ہر صنف سخن میں اپنی پہچان رکھتا ہے۔ فارسی ذخیرۂ ادب میں جناب صمصام الدولہ شاہنواز خاں شہید کی شروع کردہ 'مآثر الامرا' کو از سر نو ترتیب دیا اور اس میں کئی اضافے بھی کیے۔ 'مآثر الکرام فی تاریخ بلگرام' فصل اول میں 80 صوفیہ اور فصل ثانی میں 73 علمائے ہند کا تذکرہ ہے جو ۱۱۸۰ھ مطابق ۱۷۶۶ء میں مکمل ہوئی اور ۱۹۱۰ء میں حیدرآباد دکن سے شائع ہوئی۔ 'خزانۂ عامرہ' اور 'ید بیضا' فارسی شعرا کا تذکرہ ہے۔ شبلی نعمانی نے آزاد بلگرامی کے انتخاب اشعار کو غیر معیاری قرار دیا ہے۔ 'سرو آزاد' فارسی اور ہندی شعرا کا تذکرہ ہے جو ۱۹۱۳ء میں دکن سے شائع ہوا تھا۔ چشتیہ سلسلے کے مشائخ کے بارے میں 'روضۃ الاولیا' کے لکھنے والے آزاد بلگرامی کے قلم سے 'غزلان الہند' بھی نکلی۔ انھوں نے اپنا دیوان فارسی بھی چھوڑا جو دو ہزار اشعار پر مشتمل ہے (آزاد بلگرامی نے بعض جگہ فارسی اور عربی کو ملا کر ترکیب بنائی ہے)۔

باقر آگاہ مدراسی نے بڑی جسارت سے کام لیتے ہوئے 'چہار صد ایراد بر کلام آزاد' لکھی۔ آزاد بلگرامی نے دنداں شکن جواب دیتے ہوئے 'جواب الایرادات' لکھی۔ مولانا آزاد بلگرامی نے عربی میں بھی کئی شاہکار چھوڑے خاص طور پر 'سبحۃ المرجان فی آثار ہندوستان' ۱۱۷۷ھ مطابق ۱۷۶۳ء میں مکمل ہوئی۔ چار ابواب پر مشتمل اس شاہکار کا پہلا باب فضائل ہند سے تعلق رکھتا ہے جن کا تفسیر و احادیث میں ذکر آیا ہے۔ دوسرا باب ہندوستان میں اسلام کی آمد سے متعلق ہے۔ تیسرے باب میں امیر خسرو کا ذکر ہے 23 ہندوستانی صنائع و بدائع کی تفصیل ہے جنھیں آزاد نے عربی میں منتقل کرتے ہوئے ان کے لیے عربی اصطلاحات Coin کی تھیں جیسے تجزیہ، تشبیہ الشی بہ نفسہ، تشبیہ البرہان، امتزاج تشبیہ البرہان، امتزاج تشبیہ السلب وغیرہ وغیرہ۔ چوتھے باب میں معشوقات و عشاق کا ذکر ہے۔

آزاد بلگرامی نے 'شفاء العلیل' لکھی جس میں متنبی کی شاعری پر تنقید کی ہے۔ جہاں 'شجرۂ طیبہ' میں بلگرام کے سادات کا ذکر کیا ہے وہیں آزاد نے ایک سو پانچ بیت کا 'مرآۃ الجمال' جیسا قصیدہ بھی لکھا ہے جس میں معشوق کے ہر ایک عضو کی تعریف میں دو دو شعر لکھے ہیں۔ آزاد نے بحر خفیف میں مثنوی کے وزن پر منظوم حکایات 'مظہر البرکات' کے نام سے لکھیں۔ ان کی تحقیق و تدوین پر انوار العلوم کالج حیدرآباد کے صدر شعبۂ عربی محمد فضل الدین کو جامعہ عثمانیہ نے پی ایچ ڈی کی ڈگری کا مستحق قرار دیا۔

آزاد بلگرامی کو اپنی عربی دانی پر بڑا ناز تھا۔ انھوں نے اپنی تصانیف میں جگہ جگہ اس کا اظہار بھی کیا ہے کہ اس برصغیر میں ان سے پہلے کوئی ایسا قادر نہیں گزرا جس نے بہ زبان عربی اس پایہ کا کوئی دیوان چھوڑا ہو۔ شاید یہی سبب تھا جو سبع معلقات کے بالمقابل 'السبعۃ السیارۃ' کی تخلیق کا باعث بنا۔ ان کی ایک کتاب 'شمامۃ العنبر' کے نام سے بھی شائع ہوئی ہے۔ ان کی عربی استعداد شعری کے پیش نظر علماء مکہ نے آزاد کو 'حسان الہند' کا خطاب دیا تھا۔ بلگرام کی مردم خیزی میں کوئی کلام نہیں اور اگر کوئی قابل شخص اپنی قابلیت پر داد طلب ہو تو اس میں تعجب کی کوئی بات نہیں، یوں بھی تعلّی ہمارے شعرائے کرام کا شیوہ رہا ہے۔ آزاد بلگرامی تو یوں بھی کثیر الجہات شخصیت کے مالک تھے۔ انھوں نے تذکرہ، سوانح، علم عروض، شعر و ادب کی ہر صنف میں اپنا نشان چھوڑا ہے۔ ساتھ ہی ساتھ علم حدیث، تصوف اور نعت و منقبت میں بھی قابل لحاظ کارنامہ انجام دیا ہے۔ انھوں نے رسول اکرمؐ سے بے پناہ تعلق خاطر کے ساتھ ساتھ صحابۂ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین کی شان میں قصائد بھی لکھے۔ عبدالقادر جیلانی رحمۃ اللہ علیہ کی شان میں جو قصیدہ لکھا اس کا ایک شعر ان کی عقیدت کا مظہر ہے:

شرف الراسخین فی العرفان
غوث کل الرجال من جیلان

یہ شعر میں نے خاص طور پر نقل کیا ہے تاکہ یہ ثابت ہو جائے کہ آزاد بلگرامی نہ تو شیعہ مسلک سے وابستہ تھے اور نہ اہل حدیث ہی تھے۔ یوں بھی شاعر و ادیب کو مسلکوں کے خانوں میں نہیں بانٹنا چاہیے بلکہ اس کے فکر و فن کا غیر جانبدارانہ جائزہ لینا چاہیے۔

بابائے اردو مولوی عبدالحق نے 'چمنستان شعرا' کے دیباچے میں صاحب تذکرہ لچھمی نرائن شفیق اور آزاد بلگرامی کے تعلقات پر بھرپور روشنی ڈالی ہے۔ آزاد نے اپنی ایک مہر بنا رکھی تھی 'فقیر آزاد' شاید اسی رعایت سے لچھمی نرائن شفیق خود کو غلام کہا کرتے تھے، وہ آزاد کے اس قدر قریبی شاگرد تھے کہ 'بندۂ آزاد' ہو کر رہ گئے تھے۔ ان کا تخلص بھی آزاد کا دیا ہوا ہے۔ انھوں نے اپنے استاد کی شان میں باضابطہ قصیدہ بھی لکھا تھا جو مبالغے پر مشتمل ہے:

سرور ہر دو جہان آزاد ہے
والی کون و مکاں آزاد ہے
کنت کنزاً کے معانی پر خبر
واقف سر نہاں آزاد ہے
مرکز ادوار چرخ چنبری
قطب الاقطاب زماں آزاد ہے
دل سے اب صاحب ہوا ہے گا غلام
بادشاہ انس و جاں آزاد ہے

(لچھمی نرائن شفیق ابتدا میں صاحب تخلص کیا کرتے تھے)

فارسی کے مشہور شاعر شیخ علی حزیں سے میر غلام علی آزاد بلگرامی کی ملاقات ہوئی۔ حزیں نے اپنے ہاتھ سے لکھی ہوئی غزلیں آزاد کی نذر کیں اور شاد آفریں لاہوری نے آزاد سے ان کی کتاب 'ید بیضا' بصد اشتیاق حاصل کی۔ حج کے بعد آزاد سورت ہوتے ہوئے دلی پہنچے۔ الہ آباد میں اپنے والدین سے ملاقات کے بعد ۱۷۳۹ء مطابق ۱۱۵۲ھ میں اورنگ آباد آئے۔ یہاں ان کے حلقۂ احباب میں سراج اورنگ آبادی، میر عبدالولی عزلت، میر ادا، محمد رضا، مرزا علی نقی خاں ایجاد، عبدالقادر ساقی اور

(بقیہ صفحہ ۷ پر)

اردو دُنیا

غالب انسٹی ٹیوٹ میں فخرالدین علی احمد میموریل لکچر کا انعقاد

نئی دہلی (پریس ریلیز)۔ غالب انسٹی ٹیوٹ کے زیر اہتمام ۲۳ مئی کو 'ہندستان کی قومی تحریک کی تاریخ پر مختلف نظریات' کے موضوع پر فخرالدین علی احمد میموریل لکچر منعقد کیا گیا۔ اس موقع پر ممتاز مورخ اور علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے پروفیسر ایمریٹس عرفان حبیب نے اپنے لکچر میں فرمایا کہ قومی تحریک ہندستان کی اہم تحریکوں میں سے ایک ہے اور اس تحریک کی اہمیت کو کبھی بھی فراموش نہیں کیا جاسکتا۔ قومی تحریک کے بارے میں مؤرخوں کے درمیان جو موضوعات ہیں ان پر بحث کی جانی چاہیے، ۱۸۸۵ء میں انڈین نیشنل کانگریس کی ابتدا کے بعد قومی تحریک کے مخالفین میں کیا تصور تھا اور اب قومی تحریک کا کیا نظریہ ہونا چاہیے اس پر خاطر خواہ روشنی ڈالی جانی چاہیے۔ آپ نے مزید کہا کہ روشن خیال لوگوں کی نظر میں یہ تحریک اصلاحی تحریک تصور کی جاتی تھی۔ اس ضمن میں آپ نے گاندھی جی اور مختلف مفکرین کے نقطہ نظر پر بھی مختصر روشنی ڈالی۔ قومی تحریک کی افادیت کا ذکر کرتے ہوئے کہا کہ یہ تحریک ایک مشن تھی جو سرمایہ داروں کے تصور کی نفی کرتی ہے اور کسانوں اور مزدوروں کو اس کا اتفاق دلانے کی تائید کرتی ہے۔ بعض مؤرخوں کے نقطہ نظر کا حوالہ دیتے ہوئے آپ نے کہا کہ اس تحریک نے دو قومی نظریہ کی بھی نقطہ چینی کی تھی۔ برٹش رول ان انڈیا ۱۹۳۴ء میں اربندو گھوش کا ذکر کرتے ہوئے کہا کہ ہندستان کے لوگوں کا اصول تشدد نہیں ہے بلکہ شکتی ہے لیکن بدقسمتی سے بعض سخت گیر تنظیموں نے ہندستان کے بجائے ہندوستان کا نعرہ دیا جس نے قومی تحریک کے مشن کو نقصان پہنچایا۔ پروفیسر عرفان حبیب نے یہ بھی کہا کہ موجودہ دور میں قومی تحریک کو سمجھنے اور سمجھانے کی بیحد ضرورت ہے۔ اگر ہم نے قومی تحریک کے اصول و نظریات سے لوگوں کو واقف نہ کرایا تو یہ تحریک بھی دم توڑ دے گی۔ غالب انسٹی ٹیوٹ کے سکریٹری پروفیسر صدیق الرحمٰن قدوائی نے اپنے افتتاحی کلمات میں کہا کہ غالب انسٹی ٹیوٹ کی سرگرمیاں بہت محدود تھیں لیکن اب اس کے موضوعات کو وسیع کیا گیا۔ مختلف نظریات، پہلوؤں اور رویوں کے موضوعات پر لکچر کرایا جاتا ہے اور کرایا جارہا ہے۔ پروفیسر عرفان حبیب کا ذکر کرتے ہوئے انھوں نے کہا کہ پروفیسر عرفان حبیب کی تحریریں اور تقریریں اتنی اہم ہیں کہ ان سے ہندستان اور دیگر ممالک کے اسکالرز استفادہ کرتے ہیں۔ اپنی صدارتی تقریر میں ڈاکٹر پرویز علی احمد (وائس چیئرمین غالب انسٹی ٹیوٹ) نے کہا کہ پروفیسر عرفان حبیب کے اس لکچر سے موجودہ صورت حال اور قومی تحریک کو سمجھنے میں ضرور مدد ملے گی۔ پروفیسر عرفان حبیب کی دانشوری کا ذکر کرتے ہوئے ڈاکٹر پرویز نے مزید کہا کہ پروفیسر عرفان حبیب کے اہم لکچرز نہ صرف اندرون ملک بلکہ بیرون ملک میں بھی قدر کی نگاہوں سے پڑھے اور سنے جاتے ہیں۔ غالب انسٹی ٹیوٹ کے ڈائرکٹر ڈاکٹر رضا حیدر نے نظامت کا فریضہ انجام دیتے ہوئے فخرالدین علی احمد میموریل لکچر کی اہمیت پر روشنی ڈالتے ہوئے کہا کہ فخرالدین احمد لکچر غالب انسٹی ٹیوٹ کی سرگرمیوں کا ایک اہم حصہ ہے اور آج پروفیسر عرفان حبیب کی موجودگی نے اس لکچر کے وقار میں اضافہ کیا ہے۔ اس موقعے پر دہلی ہائی کورٹ کے جج اور غالب انسٹی ٹیوٹ کے ٹرسٹی جسٹس بدر دریز احمد کے علاوہ جامعہ ملیہ اسلامیہ، جواہر لعل نہرو، دہلی یونیورسٹی اور دیگر یونیورسٹی کے کالجوں کے اردو، فارسی اور تاریخ کے اساتذہ، اسکالرز اور طلبہ کے علاوہ وکلا، دہلی ہائی کورٹ کے جج اور مختلف علوم و فنون کے افراد کثیر تعداد میں موجود تھے۔

دسویں کلاس میں دہلی کے اردو میڈیم اسکولوں کا نتیجہ اطمینان بخش

ایس پی ڈی پٹودی ہاؤس، گرلز اسکول نور نگر، ایس کے وی-1 اور ایس بی وی جامع مسجد، چشمہ بلڈنگ، بلیماران اور حکیم اجمل خاں دریا گنج کا 100فی صد نتیجہ

نئی دہلی (۲۸ مئی)۔ سی بی ایس ای کے دسویں جماعت کے نتیجے کا اعلان کردیا گیا۔ راجدھانی کے اردو میڈیم اسکولوں کا نتیجہ اطمینان بخش رہا ہے اور زیادہ تر اسکولوں میں صد فی صد نتیجہ سامنے آیا ہے۔ نتیجہ بالکل شام کے وقت آنے اور کئی علاقوں میں بجلی نہ ہونے اور انٹرنیٹ سرور کے بیچ کام نہ کرنے کے سبب کئی اسکولوں کا نتیجہ نہیں مل پایا۔ جن اسکولوں کا نتیجہ مل سکا ہے ان میں ایس پی ڈی پٹودی ہاؤس، سینئر سیکنڈری گرلز اسکول نور نگر، ایس کے وی-1 جامع مسجد، ایس بی وی جامع مسجد، چشمہ بلڈنگ گرلز اسکول بلیماران اور حکیم اجمل خاں گرلز سینئر سیکنڈری اسکول دریا گنج کا نتیجہ 100 فیصد رہا جب کہ اینگلو عربک کو-ایڈ سینئر سیکنڈری اسکول اجمیری گیٹ کا نتیجہ 92 فی صد، ڈاکٹر حسین میموریل سینئر سیکنڈری اسکول جعفرآباد کا نتیجہ 99.26 فی صد اور زینت محل گرلز سینئر سیکنڈری اسکول جعفر آباد کا نتیجہ 99.66 فی صد رہا۔ حکیم اجمل خاں گرلز سینئر سیکنڈری اسکول دریا گنج اسکول میں 9 سی جی پی اے حاصل کر کے زینت اول پوزیشن پر رہی۔ کل 77 طالبات نے فرسٹ ڈویژن اور 7 نے سیکنڈ ڈویژن سے کامیابی حاصل کی۔ اسکول نے کل 60 ڈسٹنکشن حاصل کیں جن میں سائنس میں 20، ہندی میں 14 اور اردو میں 12 ڈسٹنکشن شامل ہیں۔

ڈاکٹر حسین میموریل سینئر سیکنڈری اسکول جعفرآباد میں کل 137 طالبات امتحان میں شامل ہوئیں جن میں سے 136 کامیاب رہیں۔ 9.8 سی جی پی اے حاصل کر کے اسماء صاف اول پوزیشن پر، 9.6 سی جی پی اے کے ساتھ محمد عاقب دوسری پوزیشن پر اور 9.5 سی جی پی اے حاصل کر کے عبدالمنان تیسرے نمبر پر رہے۔ زینت محل گرلز سینئر سیکنڈری اسکول جعفر آباد میں 595 طالبات میں سے 593 پاس ہوئیں۔ سعدیہ نے 9.2 سی جی پی اے کے ساتھ اول، ہما فاطمہ اور چمن آرا نے 9 سی جی پی اے کے ساتھ دوسری اور فرح اور مدیحہ نے 8.8 سی جی پی اے کے ساتھ تیسری پوزیشن حاصل کی۔ اردو موومنٹ کے کنوینر فرید احمد نے نتائج پر اطمینان کا اظہار کرتے ہوئے کہا ہے کہ ان حالات میں جب اردو میڈیم اسکولوں میں برسوں سے اساتذہ کی کمی ہے اور اردو میڈیم کے طلبہ کو وقت پر نصابی کتابیں تک مہیا نہیں ہو پاتیں، یہ بہت ہی اچھا نتیجہ ہے۔ نور نگر گرلز اسکول کی پرنسپل اور معروف شاعرہ ڈاکٹر شبانہ نذیر نے کہا کہ نتائج حالاں کہ اطمینان بخش ہیں لیکن ان میں سدھار کی کافی گنجائش ہے۔ انھوں نے کہا کہ ہمیں اور اچھے نتائج حاصل کرنے کی کوشش کرنی چاہیے۔

(راشٹریہ سہارا، دہلی)

ماریشس میں پرائمری اور ثانوی اسکولوں میں اردو کی تعلیم جاری

ماریشس کے معروف مصنف اور ادب دوست شخصیت عنایت حسین عیدن کی کتاب 'چھوٹا بنگلہ نہیں بلکہ' کی رسم اجرا کے موقعے پر گنّاز جومن کا اظہار خیال

ماریشس (۲۸ مئی)۔ ماریشس ایک کثیرالمذاہب اور کثیراللسان ملک ہے۔ یہاں کی مادری زبان کریول، سرکاری زبان انگریزی، ابلاغ عامہ کی زبان فرانسیسی ہے لیکن مشرقی زبانوں میں سب سے زیادہ ترقی اردو زبان کو ملی ہے۔ ماریشس کے بیشتر پرائمری اور ثانوی اسکولوں میں اردو کی تدریس ہوتی ہے۔ مسلمانوں کے اکثر بچے اردو کو تیسری زبان کی حیثیت سے سیکھتے ہیں۔ اب اردو زبان ہماری تہذیبی شناخت بن گئی ہے۔

مذکورہ خیالات کا اظہار گنّاز جومن نے ماریشس کے سابق وزیراعظم بھارتی لکچر تھیٹر میں منعقدہ عنایت حسین عیدن کی چھٹی کتاب 'چھوٹا بنگلہ نہیں بلکہ...' کی رسم اجرا کی تقریب میں ادب نواز سامعین کے سامنے کیا۔ نظامت شعبہ اردو کی لکچرر مسز نسیب جومن نے کی۔ استقبالیہ خطاب کے بعد بی اے آنرز اردو سال سوم کی طالبہ نوشین بیوٹو نے اپنی خوش کن آواز میں علامہ اقبال کی غزل پیش کی۔ اس کے بعد بی اے آنرز اردو سال سوم کے طالب علم عبدالرحمٰن علی محمد نے پراثر انداز میں مصنف کی کتاب سے ایک افسانہ بعنوان 'آئی پوڈ' پڑھا۔ اس موقعے پر مقیم پاکستان الفت حسین اور ایم جی آئی کے ڈائرکٹر جنرل بطور مہمان خصوصی تھے۔ اس تقریب کا انعقاد ایم جی آئی اور شعبہ اردو کے اشتراک سے عمل میں آیا تھا۔

ایم جی آئی کے شعبہ اردو کے سینئر

آئی آئی ایم سی کا اردو صحافت کورس خوش آئند

نئی دہلی (۹ مئی)۔ زبان کی سب سے زیادہ ضرورت جس میدان میں ہوتی ہے وہ ہے صحافت، لیکن صحافت کی تعلیم عام طور پر ہندی اور انگریزی زبان میں ہی ہوتی ہے۔ خوشی کی بات ہے کہ مرکزی حکومت کی کوشش سے ملک کے بہترین اداروں میں سے ایک آئی آئی ایم سی میں ششماہی اردو صحافت کا ڈپلوما کورس شروع کیا گیا ہے جس سے طلبہ بھرپور فائدہ اٹھا رہے ہیں۔ آئی آئی ایم سی کے اردو صحافتی کورس میں فردوس جہاں جو اپنی بہن شبنم جہاں کے ساتھ بھدا رکھنڈ کے قصبہ گرجوال سے آئی ہے اور دہلی کے سب سے بہترین انسٹی ٹیوٹ میں شمار ہونے والے آئی آئی ایم سی سے اردو صحافت کا ڈپلوما کررہی ہیں، یہ لڑکی جب دہلی آئی تھی تو اس نے سوچا بھی نہ تھا کہ اس کو آئی آئی ایم سی میں داخلہ مل جائے گا۔ آج وہ اس کورس کو مکمل کرکے اپنے پیروں پر کھڑے ہوکر دنیا کے ساتھ قدم سے قدم ملانے کے لیے تیار ہے۔ آئی آئی ایم سی نے فردوس جہاں کو کورس مکمل کرنے میں نہ صرف مدد کی بلکہ اس کی مجبوری کو دیکھتے ہوئے شوہر کے ساتھ ہاسٹل میں رہنے کی جگہ بھی دی۔

آئی آئی ایم سی کے اردو صحافت کے اس کورس میں فی الحال 8 طلبہ و طالبات نے داخلہ لیا ہے جن کو دوردرشن، یو این آئی اور آل انڈیا ریڈیو میں انٹرن شپ کرائی گئی ہے جس سے تمام طلبہ و طالبات کافی خوش ہیں اور صحافتی خود اعتمادی سے معمور ہیں۔ اس کورس کے سربراہ وسری واستوا کہتے ہیں کہ حکومت اردو زبان کے فروغ کے لیے فکرمند ہے، چناں چہ اردو صحافت کا یہ کورس بھی حکومت کی اردو کے تئیں فکرمندی کا ہی ثبوت ہے۔ انھوں نے امید ظاہر کی کہ آئندہ اس کورس کے ذریعے اردو صحافت میں ماہرین کا جو بحران ہے اس سے نجات مل سکے گی۔

(راشٹریہ سہارا، دہلی)

اردو اسکولوں میں اردو اساتذہ کی تعداد میں کمی کا فیصلہ

ایجوکیشن ڈائرکٹوریٹ کے فیصلے پر ماہرین تعلیم حیران

لیفٹننٹ گورنر سے مداخلت کی اپیل

نئی دہلی (۱۲رمئی)۔ دہلی سرکار کے ایجوکیشن ڈائرکٹوریٹ کا اردو کے ساتھ متعصبانہ رویہ آج اس وقت بے نقاب ہوگیا جب اس نے دہلی ہائی کورٹ، قومی کمیشن برائے اقلیتی تعلیمی ادارہ جات اور دہلی اسٹیٹ اقلیتی کمیشن سب کی ہدایات کو نظر انداز کرتے ہوئے دہلی سرکار کے اسکولوں میں اردو اساتذہ کی اسامیوں میں اضافہ کرنے کے بجائے دہلی کے تقریباً تمام اردو میڈیم اسکولوں میں اردو ٹی جی ٹی اور پی جی ٹی اساتذہ کی پوسٹ مزید کم کردیں۔ ایجوکیشن ڈائرکٹوریٹ کی آج جاری ہوئی پوسٹ فکسیشن رپورٹ سے اردو میڈیم اسکولوں کے پرنسپل حیران وشسشدر ہیں کہ پہلے سے اساتذہ کی قلت جھیل رہے ان اسکولوں میں اب اردو کے طلبہ کو آخر کیسے پڑھایا جائے گا۔ معتبر ذرائع کا کہنا ہے کہ ان اسکولوں میں اردو ٹی جی ٹی اور پی جی ٹی پوسٹ کو کم کیے جانے کی وجہ یہ بتائی گئی ہے کہ دہلی کے مختلف علاقوں میں والدین کے مطالبے پر بہت سے نئے اسکولوں میں اردو بطور مضمون پڑھانے کا انتظام کیا گیا ہے، چوں کہ ان اسکولوں میں اردو اساتذہ کی ضرورت ہے اس لیے، اسکولوں سے اردو اساتذہ کی پوسٹ میں تخفیف کی جارہی ہے۔ پوسٹ فکسیشن رپورٹ کے مطابق جو صورت حال اب تک سامنے آئی ہے اس کے مطابق شمال مشرقی دہلی کے زینت محل گرلز سینئر سیکنڈری اسکول جعفرآباد میں اردو ٹی جی ٹی کی 9 پوسٹ ختم کردی گئی ہیں۔ ابھی تک یہاں اردو ٹی جی ٹی کی 11 پوسٹ تھیں جو کہ اب محض 2 رہ گئی ہیں۔ اس کے علاوہ اردو پی جی ٹی کی پوسٹ 2 سے کم کرکے محض ایک کردی گئی ہے۔ آپ کو حیرت ہوگی کہ یہ دہلی میں لڑکیوں کا سب سے بڑا اردو میڈیم سینئر سیکنڈری اسکول ہے، جس میں اس وقت 5500 طالبات تعلیم حاصل کررہی ہیں۔ جامعہ نگر کے ذاکر نگر علاقے میں واقع گرلز سینئر سیکنڈری اسکول میں بھی اردو ٹی جی ٹی کی 5 پوسٹ ختم کردی گئی ہیں اور اب وہاں 7 کی جگہ صرف 2 اردو ٹی جی ٹی باقی ہیں، اسکول میں 1 ہزار سے زیادہ طالبات زیر تعلیم ہیں۔ اسی طرح سروودیہ کنیا ودیالیہ نمبر2 جامع مسجد میں اردو ٹی جی ٹی کی 2 پوسٹ، گورنمنٹ بوائز سینئر سیکنڈری اسکول میں ایک پوسٹ، چشمہ بلڈنگ سینئر سیکنڈری اسکول میں ایک پوسٹ، گورنمنٹ بوائز سینئر سیکنڈری اسکول جعفرآباد میں 2 پوسٹ، کلاں محل گرلز اسکول میں ایک پوسٹ، بلّی ماران سے ایک پوسٹ اور ایس بی وی پٹودی ہاؤس میں ایک پوسٹ اردو ٹی جی ٹی کی ختم کردی گئی ہے۔ دریں اثنا فصیل بند شہر میں سائنس اسٹریم کے واحد اردو میڈیم اسکول میں فزکس اور کیمسٹری کے پی جی ٹی کی پوسٹ بھی ختم کردی گئی ہے۔ دلچسپ بات یہ ہے کہ اردو میڈیم اسکول کے ایک پرنسپل نے اپنا نام شائع نہ کرنے کی شرط پر بتایا کہ ان کے اسکول میں ہندی ٹیچر کی کوئی ضرورت نہیں ہے اس کے باوجود جبراً ہندی ٹیچر بھیجے جارہے ہیں۔

کئی اسکولوں کے پرنسپل اس فیصلے سے سخت ناراض ہیں لیکن وہ کچھ کہنے سے قاصر ہیں۔ سابق پرنسپل مشتاق بیگ نے کہا کہ یہ افسروں کے متعصبانہ رویے کا ایک اور ثبوت ہے۔ اردو موومنٹ کے کنوینر فرید احمد نے کہا کہ پوسٹ کی تخفیف تو اس وقت ہوتی ہے جب طلبہ کی تعداد میں کمی آگئی ہو۔ اسکولوں میں تو طلبہ کی تعداد مسلسل بڑھ رہی ہے ایسے میں نئے اساتذہ کی تقرری ہونی چاہیے نہ کہ پوسٹ میں اور کٹوتی کردی جائے۔ انھوں نے کہا کہ لیفٹننٹ گورنر نجیب جنگ کو اس معاملے میں مداخلت کرنی چاہیے تاکہ اردو طلبہ کے مستقبل کو تاریک ہونے سے بچایا جاسکے۔ قابل ذکر ہے کہ دہلی ہائی کورٹ نے ۲۳راپریل کو ہوئی سماعت کے دوران ایجوکیشن ڈائرکٹوریٹ سے یہ جواب طلب کیا تھا کہ اردو میڈیم اسکولوں میں اساتذہ کی قلت کیوں ہے۔ اس کے علاوہ قومی کمیشن برائے اقلیتی تعلیمی ادارہ جات کے چیئرمین جسٹس سہیل اعجاز صدیقی نے دہلی کے ایجوکیشن ڈائرکٹر کو کمیشن میں طلب کرکے وضاحت کرنے کو کہا ہے کہ اردو اسکولوں میں اردو اساتذہ کا تقرر کیوں نہیں کیا جارہا ہے۔

(راشٹریہ سہارا، دہلی)

لکچرر ڈاکٹر ریاض توحیدی کوکول نے مصنف کا تعارف کراتے ہوئے کہا کہ وہ ریٹس میں گزشتہ تقریباً چار دہائیوں کے دوران عنایت حسین عیدن اردو کی توسیع و اشاعت کا اہم مرکز ومحور رہے ہیں، وہ ۱۹۶۵ء میں اعلا تعلیم حاصل کرنے کی غرض سے علی گڑھ مسلم یونیورسٹی پہنچے جہاں سے انھوں نے بی اے اور ایم اے اردو فرسٹ ڈویژن سے پاس کیا اور وطن واپس آگئے۔ ۱۹۷۵ء میں ماریشس واپسی پر دلی میں اردو انسٹی ٹیوٹ کے قیام میں بنیادی کردار ادا کیا۔

ایم جی آئی کے صدر شعبہ اردو ڈاکٹر احمد رحمت علی نے استقبالیہ خطاب میں کہا کہ یہ کتاب ۱۹۷۰ء سے ۲۰۱۳ء تک کا احاطہ کرتی ہے۔ مصنف نے نہ تو اعلا اور نہ ہی ذہنی کی حیثیت سے اپنی تحسین پیش کی ہے بلکہ سماج کے مسائل کی نشاندہی کی ہے۔

عنایت حسین عیدن نے کہا کہ چند افسانوں کے خاکے تیس سال پہلے ان کے ذہن میں پیدا ہوچکے تھے لیکن موجودہ زمانے سے ہم آہنگ کرکے ان کو لفظوں کا جامہ پہنایا گیا۔ انھوں نے کہا کہ لاوارث قبر کو بس سفر فرانس سے جوڑ کر پچھلے چند برسوں سے انھیں فرانس اور انگلینڈ میں سفر کرنے کے متعدد مواقع میسر ہوئے۔ مصنف کے مطابق ان کے افسانوں میں سماج کے حقائق بدرجۂ اتم موجود ہیں۔ مصنف نے اپنے دو افسانوں بعنوان 'آئی پوڈ' اور 'دستور' پر تبصرہ بھی کیا۔

(انقلاب، دہلی)

بہار کے پرائمری اسکولوں میں 39ہزار اساتذہ بحال ہوں گے

پٹنہ (۲۰رمئی)۔ صوبے کے پرائمری اسکولوں میں اساتذہ کی کمی کے پیش نظر ریاستی حکومت نے تقریباً 39 ہزار اساتذہ بحال کرنے کا فیصلہ کیا ہے۔ پارلیمانی انتخابات کے بعد ان اسکولوں میں اساتذہ کی بحالی کا عمل شروع کیا جائے گا اور جون جولائی تک اساتذہ کے خالی عہدے پُر کرلیے جائیں گے۔ محکمہ تعلیم نے اس پر کارروائی شروع کردی ہے اور اس کی تیاریاں کی جارہی ہیں۔ واضح ہو کہ فروری ۲۰۱۳ء میں کیمپ لگا کر اسکولوں میں تقرر نامے تقسیم کیے گئے تھے مگر ان کیمپوں میں صرف 25 ہزار امیدواروں کو ہی جوائننگ لیٹر تقسیم کیے گئے اور 39925 عہدے خالی رہ گئے تھے۔ محکمہ تعلیم کے ذرائع کے مطابق پارلیمانی انتخابات کے ختم ہوتے ہی ایک بار پھر کیمپ لگا کر اساتذہ کا انتخاب کیا جائے گا۔ محکمہ تعلیم گزشتہ کیمپوں میں درپیش مشکلات کو دیکھتے ہوئے نئے کیمپوں میں پکھ ترمیم بھی کرنے کی تیاریاں کررہا ہے، تاکہ کیمپ میں لگی درخواست دہندگان کی درخواستوں کو نمٹایا جاسکے اور ان کی میرٹ لسٹ شائع کرکے جلد از جلد اساتذہ کی تقرری کی جاسکے۔

(انقلاب، دہلی)

پروفیسر خالد محمود دہلی اردو اکادمی کے وائس چیئرمین نامزد

نئی دہلی (یو این آئی)۔ دہلی کے لیفٹننٹ گورنر عزت مآب نجیب جنگ نے جامعہ ملیہ اسلامیہ کے شعبۂ اردو کے استاد پروفیسر خالد محمود کو اردو اکادمی دہلی کی گورننگ باڈی کا وائس چیئرمین نامزد کیا ہے۔ پروفیسر خالد محمود شعبۂ اردو میں درس و تدریس کے فرائض انجام دینے کے ساتھ ساتھ مکتبہ جامعہ لمیٹڈ کے اعزازی ڈائرکٹر بھی ہیں۔ ان کی سربراہی میں مکتبہ کے اشاعتی ذخیرے میں بیش بہا اضافہ بھی ہوا ہے۔ ان کی کوششوں اور کاوشوں سے قومی اردو کونسل کے اشتراک سے وہ تمام مطبوعات دوبارہ شائع ہوگئیں جو برسوں سے نایاب تھیں یا اشاعت پذیر نہیں ہوسکی تھیں۔ پروفیسر خالد محمود کا اردو اکادمی سے دیرینہ تعلق رہا ہے، وہ اس وقت بھی اردو اکادمی کی گورننگ کونسل کے ممبر اور تحقیق و اشاعتی کمیٹی کے کنوینر ہیں۔ پروفیسر خالد محمود کی تقریباً ایک درجن تحقیقی و تخلیقی کتابیں منظر عام پر آچکی ہیں۔ نصابی کتابوں کے ادارے این سی ای آر ٹی، ایس سی ای آر ٹی نے بھی ان کی صلاحیتوں سے فائدہ اٹھایا۔

(آگ، لکھنؤ)

جامعہ ملیہ اسلامیہ میں پہلی بار اردو سرٹیفکٹ کورس کا آغاز

نئی دہلی (۱۰رمئی)۔ جامعہ ملیہ اسلامیہ نے اس سال اپنے مختلف شعبوں میں جہاں نئے کورسز شروع کیے ہیں وہیں شعبۂ اردو جامعہ ملیہ اسلامیہ نے پہلی بار اردو کا سرٹیفکٹ کورس کا آغاز کیا ہے، یہ ریگولر کورس ایک سال کا ہے۔ یہ کورس ان لوگوں کے مدنظر شروع کیا گیا ہے جو اردو سیکھنے کے خواہش مند ہیں۔ جامعہ ملیہ اسلامیہ میں بی اے کی سطح کے تمام کورسز میں اردو کو لازم قرار دینے کے بعد فروغ اردو کی یہ دوسری مہم ہے جس کو شعبۂ اردو کے تحت شروع کیا گیا ہے۔ اس کی کلاسز شام میں ہوں گی تاکہ برسر روزگار افراد کے علاوہ دوسرے ریگولر طلبہ بھی اس میں شامل ہوسکیں۔ شعبۂ اردو کے صدر پروفیسر وہاج الدین علوی نے اپنی تصویر نہ لگانے کی شرط پر بتایا کہ یہ کورس تمام لوگوں کے لیے ہے۔ اس کورس میں ہر وہ طالب علم حصہ لے سکتا ہے جس نے ہائی اسکول کی تعلیم مکمل کرلی ہو۔ انھوں نے اس بات کی امید ظاہر کی کہ اس کورس کے بہت اچھے اثرات مرتب ہوں گے۔

(انقلاب، دہلی)

رفتید ولے نہ از دل ما

اردو کے مشہور و ممتاز صحافی جناب سید علی عباس کا ۱۳رمئی ۲۰۱۳ء کو انتقال ہوگیا۔ وہ ۸۲ برس کے تھے اور کافی عرصے سے بیمار چل رہے تھے۔ ڈاکٹروں کے مشورے کے بعد انھیں لکھنؤ واقع پی جی میڈیکل کالج میں داخل کرایا گیا تھا جہاں ان کا ۱۳رمئی کی رات تقریباً 9.35 بجے انتقال ہوگیا۔ مرحوم کے پس ماندگان میں اہلیہ، تین بیٹے اور ایک بیٹی شامل ہیں۔ ان کی تدفین ان کے آبائی وطن ضلع ایٹہ کے مارہرہ قصبے میں ۱۵رمئی کو بعد نماز عشا عمل میں آئی۔

سید علی عباس نے 80 کی دہائی میں صحافت کی دنیا میں قدم رکھا۔ انھوں نے دہلی کے کئی اردو اخبارات میں کام کیا۔ انھیں اردو اور انگریزی زبان و بیان پر قدرت حاصل تھی۔ وہ یوپی کے اکریڈیشن بورڈ سے بھی منسلک رہے۔ انھوں نے ۱۹۸۵ء کے آس پاس گورکھپور کا رخ کیا تو پھر وہ گورکھپور کے ہی ہوکر رہ گئے۔ ۲۰۰۲ء میں جب گورکھپور سے روزنامہ 'راشٹریہ سہارا' کی شروعات ہوئی تو انھوں نے یہاں بھی اپنی خدمات انجام دیں۔ صحافت کی دنیا میں انھیں کافی عزت حاصل تھی۔

ادارہ 'ہماری زبان' مرحوم کے لیے مغفرت اور پس ماندگان کے لیے صبر جمیل کی دعا کرتا ہے۔ (ادارہ)

٭

پٹنہ۔ مشہور و ممتاز صحافی اور بہار شرمجیوی پترکار یونین کے سابق صدر جناب محمد مرغوب کا حرکت قلب بند ہوجانے کی وجہ سے ۲۳رمئی ۲۰۱۴ء کو انتقال ہوگیا۔ وہ 85 برس کے تھے۔ محمد مرغوب نے ۲۳رمئی کی صبح قریب چار بجے سبزی باغ واقع اپنی رہائش پر آخری سانس لی۔ مرحوم کے پس ماندگان میں ایک بیٹا اور ایک بیٹی ہے۔ محمد مرغوب صاحب اردو صحافت سے کافی عرصے سے وابستہ تھے۔ وہ پٹنہ سے شائع ہونے والے اردو روزنامہ 'صدائے عام' کے ایڈیٹر بھی رہ چکے ہیں۔ انھوں نے صحافت اور صحافیوں کے حقوق کے لیے ہمیشہ آواز بلند کی۔

ادارہ 'ہماری زبان' مرحوم کے لیے مغفرت اور پس ماندگان کے لیے صبر جمیل کی دعا کرتا ہے۔ (ادارہ)

نئی کتابیں

تبصرے کے لیے دو کتابوں کا آنا ضروری ہے

نام کتاب : مکاں سے لامکاں تک (شعری مجموعہ)
مصنف : ڈاکٹر اختر حسین شاقی
اشاعت : ۲۰۱۳
ضخامت : ۱۹۷ صفحات
قیمت : ۱۵۰ روپے
ناشر : ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس دہلی-۶
تبصرہ نگار : امیر حمزہ
ameerhamzah033@gmail.com

ڈاکٹر اختر حسین شاقی ایک قلندرانہ صفت شخصیت کا نام ہے جو وقتاً فوقتاً رسائل وجرائد میں شائع ہوتے رہے۔ انھوں نے شاعری کے میدان میں بھی اپنی ایک شناخت قائم کی۔

'مکاں سے لامکاں تک' کے شائع ہونے سے پہلے ان کی دو کتابیں انگریزی میں منظر عام پر آکر شرف قبولیت سے سرفراز ہو چکی ہیں۔ ان کی دو کتابیں the milieu اور the creator, creation and creative imagination ہیں۔ اس کے بعد ان کی یہ تیسری کتاب 'مکاں سے لامکاں تک' شاعری میں ہے۔ اس کتاب کے مطالعے سے بعد یہ بات سامنے آتی ہے کہ انھوں نے اپنے اصول شاعری سے کوئی سمجھوتہ نہیں کیا جس کے متعلق وہ خود لکھتے ہیں:

"شاعری کو جہاں تک میں نے پہچانا ہے یہ ایک انسانی تخلیق ہے جو انسان کی ذات سے وابستہ ہے۔ یہ انسان کے جذباتی تجربات سے ابھرتی ہے اور زندگی پاتی ہے"۔

اس خیال کا اظہار انھوں نے یوں کیا ہے:

بندش الفاظ ہی سے شاعری ہوتی نہیں
صرف ہی لینے سے، جیسے زندگی ہوتی نہیں
شاعری کیفیت جذب جنوں کا نام ہے
یہ نہ ہو تو شاعری پھر شاعری ہوتی نہیں

شاقی نے اپنی اس کتاب میں کئی عنوانات قائم کیے ہیں۔ ان عناوین سے پہلے انھوں نے مقدمہ کے طور پر اپنی تحریر 'میری شاعری کا نظام فکر' میں بارہ نظام فکر پیش کیے ہیں۔ اس کے بعد انھوں نے 'نظمیں' کے عنوان کے تحت اٹھارہ نظمیں شامل کی ہیں، جن میں سے ایک نظم 'شاعری' بھی ہے۔ ان کی اس نظم کے متعلق رفیق شاہین صاحب فرماتے ہیں:

"ان کی نظم 'شاعری' محض شاعری کی تعریف ہی بیان نہیں کرتی بلکہ فلسفیانہ طرز فکر بھی رکھتی ہے۔ انھوں نے خدا اور انسان کے مابین خط فاصل کھینچنے کے بطور خالق کل اور خالق انسانی، تخلیق حقیقی اور تخلیق مجازی جیسی اصطلاحات کو اس خیال سے وضع کرنا ضروری سمجھا ہے کہ انسان اپنی حد میں رہے اور خدائی کا خطر لاحق نہ ہو"۔

گرمی جذبات میں امکاں نہیں ہوتے کبھی
دل کی چنگاری فروغ دائمی ہوتی نہیں
جو بھی ہو لیکن ہمارے واسطے یہ شاعری
پردہ دار رازہائے زندگی ہوتی نہیں

'غزل نما نظمیں' کے عنوان کے تحت کتاب میں 23 نظمیں شامل ہیں۔ پھر دیگر موضوعات کے تحت 12 نظمیں شامل ہیں۔ اس کے بعد انھوں نے دو اور عنوان قائم کیے ہیں ایک 'مثبت نظریۂ حیات' اور دوسرا 'سود و طریقے کا اظہار' ہے۔

ان کی شاعری کے نظام فکر میں ایک بہت ہی اہم محور رہا ہے، چاہے وہ رہا کا ٹوٹنا ہو، رہا کا قائم ہونا ہو یا رہا کی تلاش۔ رہا کی یہ تینوں جہتیں ذاتی سطح پر اور عالمی سطح پر ہے۔ جن نظموں میں ان اسباب کی طرف اشارہ کیا گیا ہے وہ یہ ہیں: 'روح ارضی سے فلک کا خطاب'، 'ذوق نظر'، 'آزادی وجمہوریت'، 'تم بھی جیتے رہو ہم بھی جیتے رہیں'، 'کل رات کو' اور 'رنگ گل کی بے رنگی' وغیرہ۔

رہا انسانی جذبات میں سے ایک جذبہ ہے اور جذبات ہی شاعری کو زندگی بخشتے ہیں اور جاندار بناتے ہیں۔ یہی وجہ اس مجموعۂ کلام میں ان جذبوں کو بنیادی حیثیت دی گئی ہے۔ انھوں نے دیگر موضوعات اور حالات حاضرہ کے منظر میں بھی نظمیں لکھی ہیں ان میں سے کچھ نظمیں یہ ہیں: 'بہت سخت ہیں نئی بندگی ہے'، 'فکر معاش'، 'رنگ گل کی بے رنگی'، 'وادی کشمیر'، 'عرب اور اسرائیل' وغیرہ۔

یہ کتاب شاعری کے میدان میں ایک نیا ذائقہ اور ایک نئی آواز ہے اور ہر ایک نئی چیز کی کامیابی اس کے دوام میں ہے۔ مجھے امید ہے کہ یہ کتاب ادبی حلقوں میں شرف قبولیت سے سرفراز ہوگی۔ کتاب طباعت کے لحاظ سے دیدہ زیب ہے اور قیمت بھی مناسب ہے۔

●●●

نام کتاب : تدریس کے عصری تقاضے
مصنف : محمد فاروق انصاری
ضخامت : ۱۳۵ صفحات
قیمت : ۱۰۰ روپے
ناشر : گولڈن گرافک اینڈ پرنٹرس دہلی
تبصرہ نگار : عادل احسان

تعلیمی اور تدریسی ادارے ذہن انسانی کی تعمیر وتشکیل کے کارخانے ہیں۔ انسانی زندگی کو سلیقہ اور قرینہ عطا کرنے اور ایک آدمی کو انسان یا شخصیت کے زمرے میں لاکھڑا کرنے کے لیے تعلیم و تدریس کی اہمیت ایسی ہے جیسے کہ انسانی جسم کے لیے دماغ کی۔ عصر حاضر میں درس و تدریس نے واقعی ترقی کی راہیں طے کی ہیں اور مسلسل ارتقا کی منزلوں پر گامزن ہے، مگر افسوس ناک امر یہ ہے کہ ظاہری اور خارجی سطح پر تعلیم و تدریس کا رواج تو عام ہوا ہے مگر مقاصد اور روحانی اعتبار سے اس کی اہمیت اور قدر و قیمت مجروح ہوئی ہے۔ اساتذہ کی ذمہ داریوں اور شخص میں آئے زوال نے تعلیم و تدریس کے عمل کو بری طرح سے نقصان پہنچایا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ درس و تدریس اور تعلیم وتعلم کا عمل اب پیشہ ورانہ طرز اختیار کر گیا ہے۔ اب نہ ہی اساتذہ کے اندر وہ اوصاف ہیں اور نہ طلبہ کے اندر وہ بات جو پہلے تعلیم وتعلم کے تقاضے تھے یا مثالیں ہوا کرتی تھیں۔ اساتذہ طلبہ کو تعلیم سے آراستہ تو کرتے ہیں مگر تربیت کے تئیں برتی جا رہی ہے تو بھی نے ان کی کوششوں اور بے خلوص جذبے کو کھوکھلا ثابت کر دیا ہے، اس لیے یہ بے حد ضروری ہے کہ اس کو از سر نو آب و تاب عطا کرنے اور مستحکم و پائیدار بنانے کے لیے اس سمت میں توجہ دی جائے۔ اس اعتبار سے محمد فاروق انصاری کی کاوشیں لائق ستائش ہیں، ان کی تازہ ترین کتاب 'تدریس کے عصری تقاضے' کو اس سلسلے کی اچھی اور نتیجہ خیز کوشش کہنا بہت مناسب ہوگا۔

محمد فاروق انصاری کی مرتب کردہ اس کتاب میں تعلیم کے متعلق بہت ہی سچی خیز باتیں بتائی گئی ہیں، اس میں تدریس کے حوالے سے بحث کی گئی ہے۔

مصنف کا ماننا ہے کہ گزشتہ کئی دہائیوں میں تعلیم وتعلم کے عمل سے متعلق بہت ساری تحقیقات ہوئی ہیں اور نئے نئے نتائج سامنے آئے ہیں جس کی بنا پر یہ کہا جا سکتا ہے کہ درس و تدریس نے اس میدان میں نئی نئی تکنیک سے لوگوں کو روشناس کرایا ہے۔ تدریس کے نئے طریقے اور تکنیکیں بھی وضع کی گئیں۔ پیاجے، واگوٹسکی، تووک، ہاکنس، پوزنر جیسے ماہرین نے اپنی اپنی تحقیقات کا موضوع ہی اسے بنایا کہ طلبہ کے اندر کس طرح کے علم کی تعمیر کو رواج کیا جائے اور استاد اپنے طلبہ کے اندر کس طرح اپنے تصورات کی رہنمائی کرتے ہیں، اس کی مثال یہاں بہت حد تک یہ ماہرین اس طرح بیان کرتے ہیں۔ پیاجے نے 'بچے میں ذہانت کی نشوونما' (The origin of intelligence in the child)، تووک نے 'آموزش کس طرح سیکھیں' (Learning: how to learn)، واگوٹسکی نے 'خیالات اور زبان' (Thought and language) میں جن حقائق کا انکشاف کیا ان کا حاصل یہ تھا کہ جب کسی شخص یا افراد کا کسی نئی معلومات سے سابقہ پڑتا ہے تو وہ اسے نئے مواد کے ذریعے سے معنی اخذ کرنے کے لیے اپنے سابقہ علم اور ذاتی تجربات کا استعمال کرتا تو اس کے اندر ایک نیا جوش پیدا ہو جاتا ہے جس سے وہ تدریس کو اپنے دل و دماغ میں سمو لیتا ہے۔

جہاں تک ہندستانی زبان کا تعلق ہے اس کے لسانی تکثیریت نے جہاں کئی پیچیدہ صورت حال پیدا کر دی ہے وہیں اس کے افہام وتفہیم نے بے شمار ایسے مواقع فراہم کیے ہیں جس کی بنا پر یہ کہا جا سکتا ہے کہ لسانیات نے کسی زبان کو بہت اچھی طرح معلومات فراہم کی ہے اور نئے نئے زاویے کے ذریعے نئے خاندانوں سے روبرو کرایا۔ ہندستان پہلا ایسا ملک ہے جس میں سب سے زیادہ پانچ مختلف لسانی خاندانوں یعنی ہند آریائی، دراوڑ، آسٹرو ایشیاٹک، تبتی برمی اور انڈمانی زبانیں رائج ہیں۔ اگر ساخت کے اعتبار سے دیکھا جائے تو یہ مختلف ہوتے ہوئے بھی ایک دوسرے سے بہت حد تک جڑی ہوئی ہیں۔ ان زبانوں میں کئی لسانی اور سماجی خصوصیات مشترک ہیں جو ایک دوسرے کو فائدہ پہنچاتی ہیں۔

ایسا گمان ہے کہ سب سے پہلی کتاب چین میں ۸۶۰ء میں شائع ہوئی تھی جب کہ مغرب میں کتابوں کی طباعت کا آغاز پندرہویں صدی عیسوی میں ہوا اور وہاں پہلی کتاب ۱۴۵۵ء میں منظر عام پر آئی، مگر سولہویں صدی کے شروع میں کئی پرنٹنگ پریس قائم ہو جانے کی وجہ سے بڑے پیمانے پر کتابیں شائع ہونے لگیں۔ اسی عہد میں ہندستان میں بھی کتابوں کی اشاعت کا سلسلہ شروع ہوتا ہے جس میں پرتگالی مشنریوں نے گوا میں چند مذہبی کتابیں شائع کیں جنھیں درسی کتب کی حیثیت حاصل ہے۔ غالباً پرتگالی زبان کی پہلی کتاب ۱۵۵۹ء میں منظر عام پر آئی جس کا نام Conclusoes de logica e philosophia تھا۔

'تدریس کے عصری تقاضے' محمد فاروق انصاری کی مرتب کردہ کتاب ہے جس میں انھوں نے کل تیرہ مقالات کو جمع کیا ہے۔ یہ مقالات بیشتر ایسے اشخاص کے ہیں جو درس وتدریس سے منسلک ہیں اور اس شعبۂ زندگی پر ان کی خاصی گہری نگاہ ہے۔ یہ مضامین ان کے تجربات اور معلومات ومشاہدات کے حامل ہیں۔ تعلیم وتعلم اور درس وتدریس کے اعمال و آثار کو ان مضامین کی روشنی میں مختلف زاویے سے دیکھنے کی کوشش کی گئی ہے اور یہ تحرکات بہت مفید وسودمند ہیں۔ کتاب میں شامل اولین تین مضامین محمد فاروق انصاری کے ہیں۔ 'تدریس کے تقاضے' میں انھوں نے موجودہ عہد کے تناظر میں تدریس کو دیکھنے کی کوشش کی ہے۔ ان کی کاوش رہتی ہے کہ یہ عمل جدید عہد کے تقاضے سے ہم آہنگ ہو۔ اس لیے یہ بھی ضروری تھا کہ اسے متحرک اور موثر بناکر اس کے فوائد کو عام کیا جائے اور بہتر سے بہتر نتائج برآمد کیے جاسکیں۔ مرتب موصوف کا دوسرا مضمون 'متن کی قرأت' سے متعلق ہے۔ اس سے زبان دانی اور اقدار و قدر کے اصول و آداب آتے ہیں۔ تیسرا مضمون 'تعمیر پسندی اور تدریس' ہے۔ کتاب میں شامل مضامین 'اردو ذریعہ تعلیم' از محمد نعمان خان، 'اردو رسم الخط کی تدریس' از بشیر احمد انصاری، 'تحریری تدریس کا طریقہ کار' از مختار علی، 'زبان کی تدریس اور تعلیم' از رجیش مشرا، 'اردو زبان کی تدریس میں جدید طریقوں اور تکنیکوں کا استعمال - ایک مطالعہ' از محمود صدیقی، 'حق تعلیم ایکٹ اور اردو تدریس' از رضوان الحق موضوع سے متعلق اور بے حد اہم ہیں۔ علاوہ ازیں مقالے علمی تحقیق - درسی کتاب اور اس کا ارتقا، تراجم کی صورت حال، تحقیقی صلاحیتوں کی تربیت، بالترتیب مقالہ نویس زبیدہ حبیب، قاسم خورشید اور محمد حسن فاروقی بھی قابل قدر اور استفادے کے لائق ہیں۔

محمد فاروق انصاری کی کتاب 'تدریس کے عصری تقاضے' کی سب سے بڑی خوبی یہ ہے کہ اس میں تدریس سے متعلق بہت ساری معلومات فراہم کی گئی ہیں اور تعلیم وتعلم سے دل چسپی رکھنے والوں کے لیے یہ کتاب بے حد اہم ہے۔

●●●

بقیہ: قلم کارنامی - آزاد بلگرامی

صفحہ ۳ سے آگے

بھی زبان شفیق تھے۔ آزاد یہاں تکیہ شاہ مسافر میں ٹھہرے ہوئے تھے۔ دکن کے دیگر مقامات کی سیاحت بھی کی لیکن مستقلاً قیام اورنگ آباد ہی میں رہا۔ تقریباً اڑتیس سال اورنگ آباد میں داد تحقیق دیتے رہے۔ آخر کار ۳۰ر ذی قعدہ ۱۲۰۰ھ مطابق ۱۵ر ستمبر ۱۷۸۶ء کو انتقال فرمایا۔ آہ غلام علی آزادؔ سے ان کی تاریخ وفات برآمد ہوتی ہے۔ امام الدولہ امیر حسن تیموری دہلوی خلد آباد دکن میں اس مقبرے کے اندر دفن ہوئے جسے آپ نے خواب گاہ روضہ کے نام سے ۱۱۹۱ھ ہی میں تعمیر کروا رکھا تھا۔ آپ کے صاحبزادے نور الحسن کا آپ کی حیات ہی میں انتقال ہو چکا تھا مگر آپ کے پوتے امیر حیدر بلگرامی کی اولاد آج بھی حیدرآباد دکن اور پاکستان میں موجود ہے۔

اشاریات

١- شاہکار اسلامی انسائیکلوپیڈیا (مدیر سید قاسم محمود)
٢- تاریخ ادبیات مسلمانان پاکستان و ہند (مرتبین: سید فیاض محمود، پروفیسر عبدالقیوم)، دوسری اور پانچویں جلد، پنجاب یونیورسٹی، لاہور
٣- مقالات شبلی، جلد نہم، دار المصنفین، اعظم گڑھ
٤- چمنستان شعرا، لچھمی نراین شفیق، انجمن ترقی اردو اورنگ آباد دکن
٥- مظہر البرکات، تحقیق و تدوین از ڈاکٹر محمد فضل الدین، صدر شعبۂ عربی، انوار العلوم کالج، حیدرآباد، اے پی

●●●

بقیہ: ایک خوبصورت زندگی کا المناک انجام

صفحہ ۸ سے آگے

تھا۔ جب وہ صحت مند تھی تو ہفتے میں ایک بار اپنی بہنوں کے ساتھ برقعہ پہن کر کسی سنیما ہال میں کوئی نئی یا پرانی ہندوستانی یا انگریزی فلم دیکھنے ضرور جایا کرتی تھی۔ فلمیں ہی اس کی تفریح کا واحد ذریعہ تھیں۔ بیماری کی حالت میں ایک روز گھر پر پروجیکٹر کے ذریعے اسے فلم دکھانے کی کوشش کی گئی تاکہ وہ سنیما ہال تک جانے کی زحمت سے بچ جائے لیکن اسکرین پر تصویریں دیکھتے ہی اس کی حالت خراب ہوگئی اور فلم بند کرنی پڑی۔

کشور کمار کا گھر سانتا کروز ایئرپورٹ کے بہت قریب تھا جہاں دن رات ہوائی جہازوں کی آمد جاری رہتی تھی۔ جب بھی اس طیاران گاہ پر کوئی طیارہ اُڑان بھرتا تھا یا اُترتا تھا تو اُسے گھر کے اوپر چکر کاٹتے دیکھ کر اس کے شور سے مدھوبالا کی طبیعت خراب ہو جاتی تھی یا دل کی دھڑکن تیز ہو جاتی تھی۔ ایسی حالت میں رہنا اس کے لیے خطرناک تھا لہٰذا وہ اپنے والد کے پاس عریبین ولا (Arabian Villa) میں رہنے لگی۔ کشور کمار ایک خوب صورت بنگلہ بنوانے کا خواہش مند تھا لیکن جس کی یہ تمنا پوری نہ ہو سکی۔

علالت کے ایام میں مدھوبالا کا زیادہ وقت یاد الٰہی میں گزرتا تھا۔ وہ قرآن شریف کا مطالعہ کرتی تھی یا پھر وظیفہ پڑھا کرتی تھی۔ زندگی کے سب شغل ختم ہو گئے تھے۔ بمبئی کی ملکۂ حسن نے گھر کے سب آئینے اتروا دیے تھے۔ وہ خود آئینے میں اپنی صورت دیکھنے کی روادار نہ تھی، خاوند بھی پریشان ہو گیا۔ وہ دل لگا کر فلموں میں کام نہ کر سکا اور اس کی مارکیٹ ویلیو کو بہت دھکا لگا لیکن اس حالت میں بھی اس نے اپنی بیوی کی دل جوئی میں کوئی کسر نہ چھوڑی۔ وہ ہمیشہ اسے ہنسانے اور خوش رکھنے کی کوشش کرتا تھا۔ ایک بار کشور کمار اسے پروڈیوسر گنیش اور پنڈت بیج ناتھ کی ایک فلم کی آؤٹ ڈور شوٹنگ کے لیے مہابلیشور لے گیا۔ مدھوبالا نے بیمار ہونے کے بعد پہلی بار اتنا لمبا سفر کیا تھا۔ اسے بیچ گنی کے ایک خوب صورت ہوٹل 'ال پلازا' میں ٹھہرایا گیا تھا اور وہ اس دوران کافی مسرور نظر آتی تھی۔ اپنی نہ سہی خاوند کی فلم کی شوٹنگ دیکھ کر اس کا دل بہلا رہا۔ وہ فلم کے ڈائریکٹر ماروتی کی بیوی کمل سے بھی ملی اور دیر تک اُن سے باتیں کرتی رہی حالاں کہ ڈاکٹروں نے اُسے زیادہ باتیں کرنے سے منع کر رکھا تھا۔

دل کا یہ روگ رفتہ رفتہ بڑھتا گیا اور وہ ایک ڈھانچہ بن کر رہ گئی۔ وہ اس قدر دل برداشتہ ہو گئی کہ اُس نے اپنی سالگرہ منانی بھی بند کر دی تاکہ بیتے ہوئے دنوں کی یادیں تازہ نہ ہوں۔ وہ جانتی تھی کہ ماضی کی یادیں بڑی دُکھ دائی ہوتی ہیں اور انہیں ذہن کے پردے پر لانے سے بڑی تکلیف ہوتی ہے۔ موت سے ایک روز قبل اس کی ۳۶ویں سالگرہ تھی جو اس نے نہیں منائی۔ شہزادہ سلیم کی محبوبہ انارکلی کی طرح مدھوبالا کی زندگی میں بھی خوشیاں کم تھیں اور غم ہزار۔ غموں کی فراوانی نے اُسے ایک زخمی پرندے کی مانند نڈھال کر رکھا تھا جس کا کوئی علاج نہ تھا۔

افق کے پردے سے آئی موت کی آواز
کہ جیسے توڑ دیا کسی نے زندگی کا ساز

فلم 'مغل اعظم' کے آخری مناظر میں جب انارکلی (مدھوبالا) شہنشاہ اکبر کی جانب سے موت کی سزا سننے کے بعد زندہ دیوار میں چنے جانے کے لیے لے جائی جاتی ہے تو پس پردہ مندرجہ بالا شعر فضا میں گونجتا ہے۔ حقیقی زندگی میں بھی ۲۳ر فروری ۱۹۶۹ء کی صبح اس کے لیے موت کا پیغام لے کر آئی اور جسم اور روح کا رشتہ منقطع ہو گیا، زندگی کی ڈور ٹوٹ گئی۔ بے رحم فرشتۂ اجل ایک نایاب موتی چرا کر بھاگ گیا۔ موت کا ایک دن معین ہے لیکن ایسے چپکے سے اچانک وہ اس دنیا سے رخصت ہو جائے گی یہ کسی کے تصور میں نہ تھا۔

مدھوبالا دل کی مریضہ ضرور تھی لیکن جس بیماری نے اچانک اُس کی جان لے لی وہ یرقان تھی۔ موت سے ایک ہفتہ قبل وہ اپنے شوہر کی فلم 'پڑوسن' دیکھنے گئی جسے جیوتی سروپ نے ڈائرکٹ کیا تھا۔ سنیل دت اور سائرہ بانو نے لیڈنگ رول ادا کیے تھے جب کہ کشور کمار کا بھی اہم کردار تھا۔ اس فلم کے انٹرول میں سنیما ہاؤس میں اُس نے نہ معلوم کیا کھالیا کہ اُس رات اُس کی طبیعت ناساز ہو گئی اور بخار ہو گیا۔ ڈاکٹر آیا اور پیٹ درد کی معمولی تکلیف سمجھ کر دوا دے کر چلا گیا۔ یرقان کی تشخیص نہ ہو سکی۔ بیماری کا پتا اُس وقت چلا جب پانی سر سے گزر چکا تھا۔

موت سے ایک گھنٹہ قبل اس کا سانس اکھڑنے لگا۔ ڈاکٹر نے ٹیکہ لگایا مگر اثر نہ ہوا۔ اسے بار بار آکسیجن دی جانے لگی۔ مرنے سے قبل اس نے اپنے بستر کے قریب کھڑے لوگوں سے التجا کی "خدا کے لیے مجھے بچا لیجیے، میں ابھی مرنا نہیں چاہتی" لیکن اس کی یہ آخری خواہش پوری کرنا کسی کے بس کی بات نہ تھی۔ سب لاچار تھے۔ اجل کو سامنے دیکھ کر بھی اس نے بڑے حوصلے کے ساتھ اپنے رشتے داروں سے کہا "اب بازی ہاتھ سے نکل گئی ہے، آکسیجن اتار دیجیے اور مجھے آرام سے مرنے دیجیے، سب میرا قصور معاف کر دیں۔ خدا حافظ"۔ آخری وقت میں اس نے کلمۂ طیبہ پڑھا اور اپنی جان مالک حقیقی کے سپرد کر دی۔

موت کے وقت اس کے پاس اس کا شوہر، اس کی بہنیں زبیب اور شاہدہ اور بہنوئی وحید الدین اور برج بھی موجود تھے۔ اُس کی بہن زاہدہ خسرہ کی بیماری کے باعث کئی دنوں سے مدھوبالا سے نہیں مل پائی تھی۔ ۲۳ر فروری کو ہی اُس نے غسل صحت کیا تھا اور وہ گیلے اور کھلے بالوں کے ساتھ بھاگی بھاگی بہن کے پاس پہنچی مگر تب تک اس کی روح قفس عنصری سے پرواز کر چکی تھی صرف اُس کا بے جان جسم وہاں پڑا تھا۔ سب اُس کی لاش کے پاس کھڑے زار و قطار رو رہے تھے۔ خان صاحب عطاء اللہ خاں کی حالت تو دیکھی نہیں جاتی تھی۔

موت کی خبر فوراً فلمی حلقوں میں پھیل گئی۔ باندرہ میں اُس کی رہائش گاہ پر سب سے پہلے اشوک کمار اور نرگس اظہار تعزیت کے لیے پہنچے، اس کے بعد کے آصف، بے کے نندہ، اجیت، کم کم، نمی، اچلا، چاند عثمانی، زیب رحمان، نمی، وہ بے گلشن، جھم، گیتا دت، ایچ ایس رویل، اوپی رلہن، پی این اروڑہ، خواجہ احمد عباس اور پریم ناتھ وہاں پہنچ گئے۔ نرگس نے میت کو غسل دلوایا اور کفن پہنا کر عزیزوں کے کاندھے پر رخصت کرایا۔ ڈھائی بجے سہ پہر جنازہ اُس کے گھر عریبین ولا باندرہ سے اٹھا کر سانتا کروز جوہو ویسٹ کے مسلم قبرستان میں لے جایا گیا۔ جنازے کو کندھا دینے والوں میں کمال امروہی، ایم صادق، اشوک کمار، پریم ناتھ اور کے آصف بھی شامل تھے۔ قبرستان پہنچنے کے بعد ایک مولوی صاحب نے نماز جنازہ ادا کی اور پھر قرآن مجید کی مقدس آیتوں کے ساتھ اس کی لاش قبر میں اُتار دی گئی۔

سنیل دت نے جو اس وقت دلی سے لوٹا تھا، سانتا کروز ہوائی اڈے سے سیدھا قبرستان گیا۔ شام کو جو لوگ اظہار افسوس کے لیے خان صاحب کے گھر گئے ان میں راج کپور، پرتھوی راج کپور، ششی کپور، آشا پاریکھ، مالا سنہا، نوشاد اور بے کشن بھی تھے۔ دلیپ کمار جو اسی شام مدراس سے لوٹا تھا اسے ہوائی اڈے پر افسوسناک خبر ملی، وہ وہاں سے سیدھا خان صاحب کے گھر گیا اور پھر قبر پر جا کر فاتحہ پڑھی۔

مدھوبالا کو خراج عقیدت پیش کرنے کے لیے اُس کے ساتھیوں نے ایک تعزیتی مجلس منعقد کی۔ راج کپور نے جو اس کی پہلی فلم 'نیل کمل' اور آخری فلم 'چالاک' (نامکمل) کا ہیرو تھا کہا "وہ پردۂ سیمیں کی سب سے خوب صورت اداکارہ تھی جس میں خداداد صلاحیتیں بدرجۂ اتم موجود تھیں، کتنے افسوس کی بات ہے کہ موت کے ظالم ہاتھوں نے اُسے ہم سے چھین لیا ہے"۔ کے آصف نے کہا کہ ایسے افسوسناک موقعے پر کوئی کیا کہہ سکتا ہے، موت کا وقت معین ہے لیکن کبھی کبھی وہ وقت سے پہلے بھی آجاتی ہے۔ اشوک کمار نے کہا کہ گو ایک عرصے سے ہمیں خدشہ تھا کہ یہ سانحہ ہوگا اور وہ بھی جانتی تھی کہ اُس کی زندگی کے چند ماہ و سال ہی باقی رہ گئے ہیں پھر بھی اُس نے اطمینان سے زندہ رہنے کی کوشش کی۔ اُس کی یہی اسپرٹ اس کے ساتھ کام کرنے والوں کو ہمیشہ اس کی یاد دلاتی رہے گی۔ مجھے یقین نہیں آتا کہ 'مغل اعظم' کی انارکلی اب زندہ نہیں ہے۔ وہ واقعی ایسی اداکارہ تھی جس کا کوئی نعم البدل ہماری فلم انڈسٹری پیش نہیں کر سکے گی۔

مشہور اسٹوری اور ڈائیلاگ رائٹر آغا جانی کاشمیری نے اُسے خراج عقیدت پیش کرتے ہوئے کہا تھا کہ "وہ مسکراہٹیں مجھے زندگی میں فرحت دیتی رہیں، ایک مسکراہٹ پنڈت جواہر لال نہرو کی تھی اور دوسری مسکراہٹ مدھوبالا کی۔ یہ مسکراہٹ مجھے فلم 'مغل' اور 'مغل اعظم' میں پورے عروج پر نظر آئی اور میں نے اُسے مبارک باد دینے کے لیے ٹیلی فون کیا۔ اس کے دو روز بعد اُس نے مجھے سینٹرل اسٹوڈیو میں آنے کی دعوت دی۔ پھر کی طرح لاکھوں دلوں میں اُس کی یاد ہمیشہ تازہ رہے گی، آج اس کی جتنی تعریف کی جا رہی ہے اُمید ہے دوسری دنیا میں اسے اس سے بھی زیادہ چاہا جائے گا۔

●●●

ایک خوب صورت زندگی کا المناک انجام

مدھوبالا کے آخری لمحات کی پُر سوز داستان

وشواناتھ طاؤس (C-38، سیکٹر 39، نوئیڈا، یو پی-201303)

- دیکھا اس بیماریِ دل نے آخر کام تمام کیا
- جب چراغِ حسن گل ہوا اور اندھیرے پھیل گئے
- جب بجھتی ہوئی آنکھوں کے سسکتے اشکوں نے اسے الوداع کہا
- جب اک جنازہ جا رہا تھا دوش پر تقدیر کے
- جب اس کے جسدِ خاکی کو قبر میں اُتارا جا رہا تھا تو سبھی سوگوار یک زبان پکار اٹھے:

اے ممتاز جہاں بیگم، اتنی جلدی سو گئیں
خدا کے لیے ایک بار تو آنکھیں کھولو

لیکن

وہ ہمیشہ کے لیے محوِ خواب ہو چکی تھی
اب اُس کو بیدار کرنا بے کار تھا
اُس کی عمر بھر کی بے قراری کو قرار آ چکا تھا
اُسے مرض سے چھٹکارا مل چکا تھا
دورِ آسمان پر زہرہ اور مشتری اس کی راہ تک رہی تھیں
کہکشاں اس کے استقبال کے لیے تیار کھڑی تھی
فرشتے گنگنا رہے تھے
چلی بھی آؤ کہ تمہارا انتظار ہے

بعض غیر مطبوعہ واقعات، محسوسات اور مشاہدات جنھیں خونِ دل میں انگلیاں ڈبو کر قلم بند کیا گیا ہے

وشواناتھ طاؤس

عارضۂ قلب نے عظیم فن کارہ مدھوبالا کو فلمی دنیا سے چھین لیا۔ اس کی بیماری خطرناک صورت اختیار کر گئی تھی جس نے بالآخر اس کی جان لے لی۔ فلموں میں کام کرنے کا اُس کا جذبہ بے پناہ تھا۔ وہ اپنے تندرست ہونے کی دعائیں مانگ رہی تھی لیکن دل کی علالت اسے جونک کی طرح چمٹ گئی تھی۔ وہ خود کو نہ زندوں میں محسوس کر رہی تھی اور نہ مردوں میں، عین اُس وقت جب کہ وہ شہرت کے ہفت آسمان پر تھی اُسے بہ عالمِ مجبوری فلموں میں کام کرنا بند کرنا پڑا۔ لاکھوں فلم بین دعا کر رہے تھے کہ وہ صحت یاب ہو جائے اور ایک بار پھر فلمی زندگی کا آغاز کر دے لیکن بارگاہِ اقدس میں اُن کی یہ دعا قبول نہ ہوئی۔

جب اُس کی نامراد بیماری کی تشخیص ہوئی تو سب گھبرا گئے۔ والد خان عطاء اللہ خان کی حالت دگرگوں ہو گئی، شوہر کشور کمار تڑپ اُٹھا۔ بمبئی کی تمام فلم انڈسٹری میں کھلبلی مچ گئی۔ جن فلم سازوں کی فلموں میں مدھوبالا کا کام ابھی باقی تھا اُنھیں سخت پریشانی ہوئی۔ کچھ نے اس کی جگہ دوسری ایکٹریسوں کو لے لیا اور کچھ نے اُس کے بغیر ہی ڈپلی کیٹ کی مدد سے اپنی فلمیں مکمل کر کے ریلیز کر دیں لیکن کہانی اور مناظر میں تبدیلیاں کرنے کی وجہ سے ان فلموں کی روح ختم ہو گئی اور وہ باکس آفس پر ناکام ہو گئیں۔ شرابی، بوائے فرینڈ، جھمرو، ہاف ٹکٹ اور جوالا انہی فلموں کے زمرے میں آتی ہیں۔ پیتی یہ لوگ، ناٹی بوائے، راز دار اور چالاک مکمل ہی نہ ہو سکیں۔

ذاتی معالج اسی گولوالا کو لے کر مدھوبالا اپنے باپ اور شوہر کے ساتھ علاج کے لیے لندن چلی گئی۔ وہاں کے ماہر ڈاکٹروں نے بتایا کہ اس کا دل بہت پھیل گیا ہے جس کی وجہ سے اس کی زندگی کو کسی بھی وقت خطرہ لاحق ہو سکتا ہے۔ انھوں نے مکمل آرام کرنے کا مشورہ دیا۔ قیمتی دوائیں تجویز کی گئیں اور چلنے پھرنے کی ممانعت کر دی۔ لندن میں قیام کے دوران کشور کمار کو وہاں کے فلمی پروانوں سے اپنی بیوی کو بچانے کے لیے بڑی ہوشیاری سے کام لینا پڑا۔ جب وہاں رہنے والے ہندوستانیوں اور پاکستانیوں کو مدھوبالا کی موجودگی کا پتہ چلا تو انھوں نے اس کی ایک جھلک دیکھنے کی کوشش میں کوئی کمی اٹھا نہ رکھی لیکن شوہر کی چالاکی نے اُن کے تمام منصوبے بیکار کر دیے۔ ایک فلمی پرستار نے ٹیلی فون پر ہی ملاقات کا لطف لینا چاہا۔ اتفاق سے ریسیور کشور کمار نے اُٹھایا۔ فلمی پرستار نے فون پر دریافت کیا کہ کیا کشور کمار ہیں؟ کشور کمار نے محسوس کیا کہ کوئی آفت آ رہی ہے۔ اُس نے فوراً اپنی آواز میں نسوانیت پیدا کرتے ہوئے جواب دیا ’’جی وہ باہر گئے ہوئے ہیں‘‘۔ کون بول رہا ہے دوسری طرف سے آواز آئی۔ کشور کمار نے پھر لڑکیوں کی سی آواز میں جواب دیا۔ ’’میں کشور کمار کی بہن بول رہی ہوں‘‘۔ اس طرح کشور کمار نے جان چھڑائی۔ بی بی سی والوں نے بھی کشور کمار کو پروگرام کے لیے مدعو کیا لیکن بیوی کی بیماری کے پیشِ نظر اس نے معذوری ظاہر کی۔

جن دنوں مدھوبالا لندن میں تھی، کچھ لوگوں کو بے پر کی اُڑانے کا سنہری موقع مل گیا۔ کسی بدبخت نے اُس کی موت کی افواہ پھیلا دی۔ اس افواہ نے بمبئی کی فلم انڈسٹری میں بے چینی پھیلا دی۔ ہر شخص کی زبان پر اس خبر کا تذکرہ تھا اور ہر کوئی حقیقت جاننے کے لیے بے تاب نظر آ رہا تھا۔ اس افواہ سے مدھوبالا کے قریبی حلقوں میں رنج و غم کی لہر دوڑ گئی، اگرچہ کسی کو بھی اس پر یقین نہیں آ رہا تھا لیکن حیران اور پریشان سب تھے۔ دو دن بعد معلوم ہو گیا کہ اس افواہ میں رتی بھر صداقت نہیں تھی۔

یہ امر کس قدر قابلِ مذمت تھا کہ مدھوبالا بمبئی سے ہزاروں میل دور ایک دوسرے ملک میں تھی لیکن اس کی موت کی افواہ پھیلا دی گئی تھی۔ اس قسم کی بے بنیاد خبر پھیلا کر کیا حاصل ہو سکتا تھا سوائے اس کے کہ تھوڑی دیر کے لیے اس کے عزیز و اقارب اور مداحوں کو پریشان کیا جائے۔ جب وہ قیمتی مشورہ حاصل کر کے وطن واپس لوٹی تو اس کی آمد کی خبر کو اگرچہ صیغۂ راز میں رکھا گیا تھا لیکن نہ جانے کس طرح لوگوں کو معلوم ہو گیا کہ وہ اپنے شوہر کے ساتھ آ رہی ہے۔ ہوائی اڈے پر ایک ہجوم جمع ہو گیا۔ یار لوگوں کی بے پر کی کا عوام کے دلوں پر اس قدر اثر پڑا کہ بیشتر لوگ ہوائی جہاز کی آمد سے پہلے ہی یہ دریافت کرتے سنے گئے کہ کیا کشور کمار اکیلا واپس آ رہا ہے؟ لیکن مدھوبالا کی موت کے متعلق وہ تمام افواہیں اس وقت بے نقاب ہو گئیں جب وہ ہوائی جہاز سے باہر آئی۔ دیکھنے والوں کو اور بھی حیرت ہوئی جب وہ ہوائی اڈے سے باہر موٹر تک پیدل چل کر آئی۔

بمبئی آنے کے بعد اس نے پروڈیوسروں سے کہہ دیا کہ اب وہ فلموں میں کام نہیں کرے گی کیونکہ ڈاکٹروں نے اُسے مکمل آرام کرنے کا مشورہ دیا ہے۔ اس کے باوجود علالت کے دوران ایک فلم ساز نے مدھوبالا سے بستر پر لیٹے لیٹے کام کرنے کا وعدہ لے لیا تھا، کہانی ایک بیمار عورت کی تھی جو پوری فلم میں اپنے بستر پر ہی پڑی رہتی ہے۔ اس فلم کی شوٹنگ کے لیے گھر سے باہر جانے کی ضرورت نہیں تھی، پوری شوٹنگ گھر کے کمرے میں ہی ہو جاتی تھی لیکن اس قسم کی کہانی کے لیے اس پروڈیوسر کو کسی فائنانسر نے پیسہ دینے کی ذمہ داری نہیں لی لہٰذا اس فلم کا پروگرام ختم ہو کر رہ گیا۔

مدھوبالا کو فلمیں دیکھنے کا بڑا شوق

(بقیہ صفحہ ۷ پر)

مدیر: اطہر فاروقی
شریک مدیر: محمد عارف خاں
پرنٹر پبلشر: شاہد خاں — مطبوعہ: ثمرہ آفسیٹ پرنٹنگ پریس، دہلی
مالک: انجمن ترقی اردو (ہند)، اردو گھر، ۲۱۲، راؤز ایونیو، نئی دہلی-۱۱۰۰۰۲
قیمت (فی شمارہ): دو روپے، سالانہ: ۵۰ روپے (بیرونی ممالک: آٹھ امریکی ڈالر)
Phones: 23237212, 23237214
E-mail: hamarizaban@atuh.org
http://www.atuh.org